نیا دور نئی غزلیں

مرتبہ

یوسف حسن رضوی

ناشر
کتب مینار پبلی کیشنز
۱۱۔ ماہم بازار ممبئی ۱۶

باراول ایک ہزار ۵۷ء

قیمت
دو روپے

تقسیم کنندگان

نیو سلور بک ایجنسی
بھنڈی بازار بمبئی ۳

خواجہ غلام جیلانی پرنٹر اتحاد پریس عمر جمال اصطبل بلاسس روڈ
بمبئی ۳ نے چھاپا اور سید سبط حسن پبلشر نے چھپوا کر دفتر کتب
مینار پبلی کیشنز ماہم بازار سے شائع کیا۔

فہرست اسمائی شعراء

جذباتِ مرتّب

غزلوں کے اس انتخاب کے پس منظر میں کیا جذبات کارگر رہے ہیں ان کا اظہار مناسب تو ہے مگر موزوں نہیں۔ گذشتہ پانچ چھ برسوں میں رسائل کے اتنے "غزل نمبر" اور اتنے انتخابات شائع ہوئے ہیں کہ مزید کسی انتخاب کی اشاعت ضروری نہیں سمجھی جا سکتی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی ایک انتخاب میں بھی انتخاب نہیں ہے بلکہ جو کچھ ملا ہے شامل کر لیا گیا ہے۔ اس سے مجموعے تو ضخیم ہو گئے ہیں مگر انتخاب نہیں رہا ہے۔ ہم نے انتخاب پر زیادہ زور دیا ہے اور اس کے لئے ان شعراء کرام سے معذرت طلب ہیں جن کے کلام سے یہ مجموعہ مرتّب ہے کہ ہم نے ان کی غزلوں میں سے غزل کا اور غزل میں سے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح بعض انکے پسندیدہ شعر اسمیں شامل نہ ہوں لیکن ہمیں یقین ہے کہ جو کچھ یہاں موجود ہے اس سے انھیں شکایت نہ ہوگی۔

ہم ممنون ہیں شعراء کرام کے جن کے تعاون کی اگر ہم کو امید نہ ہوتی تو نہ اس کام کا بیڑہ اٹھاتے اور اگر حاصل نہ ہوتا تو یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں نہ ہوتا۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری ناچیز شکریے کو قبول فرما کر آئندہ بھی ہمیں ممنون فرمائیں گے، ضرورت تھی کہ نام بہ نام ہدیۂ تشکر پیش کیا جاتا مگر فہرست طویل اور صفحے کا دامن کوتاہ ہے۔

چند شعراء سے ہمیں معذرت بھی کرنا ہے، ان کے غزلیات کے انتخاب کے سلسلے میں بھی اور طباعت میں جو خامیاں ظہور پذیر ہوئی ہیں ان کے لئے بھی۔ دراصل پروف ریڈنگ کا کام عجلت میں ہوا اور اسی سے غلطیاں رہ گئی ہیں انشاء اللہ آئندہ یہ نقص نہ رہے گا۔ اس سلسلہ میں ہمیں جناب عبدالحمید صاحب عدم سے طلبِ عفو ہے کہ موصوف کا اسم گرامی ہی غلط چھپ کر عبدالمجید عدم ہو گیا ہے۔

زبان ایک ہے دنیا کے سیکڑوں احسان
مجال کیا ہے ذرا بھی جو شکر ادا ہو جائے

یوسف حسن

علامہ آرزو لکھنوی

★

زندگی زندگی نہیں ہے ابھی — آدمی آدمی نہیں ہے ابھی
مل کے دو دل ہوئے ہیں ایک کہاں — دوستی دوستی نہیں ہے ابھی
بے کہے دل سمجھ لے دل کی بات — ہم تو سب کچھ ہی نہیں ہے ابھی
نہیں اپنی خوشی کا خواہاں کون — مگر ان کی خوشی نہیں ہے ابھی
حسن بے فیض ہے یہ کون کہے — چاند ہے چاندنی نہیں ہے ابھی
آئے کیا دل کی کروٹوں میں مزہ — درد کی چاشنی نہیں ہے ابھی
دیکھ لے پردۂ خزاں میں بہار — نظر اتنی جمی نہیں ہے ابھی
ذکرِ مے سن کے منہ بناتے ہیں شیخ — اور یہ دعوتی کری نہیں ہے ابھی
عشق ہے رہ نوردِ ہر منزل — روشنی سی ہوئی نہیں ہے ابھی
ختم ہو جستجوئے خلوتِ تام — اسقدر بےخودی نہیں ہے ابھی
دل ہو کیا فیض یابِ لذتِ درد — ٹیس راحت بنی نہیں ہے ابھی

آرزو دل کی لو کو اور بڑھاؤ
آنکھ میں روشنی نہیں ہے ابھی

اختر شیرانی

★

قرار چھین لیا بے قرار چھوڑ گئے
بہار لے گئے یادِ بہار چھوڑ گئے

ہماری چشمِ حزیں کا خیال کچھ نہ کیا
وہ عمر بھر کے لئے اشکبار چھوڑ گئے

جسے سمجھتے تھے اپنا وہ ایک مدت سے
اُسیکو آج وہ بیگانہ وار چھوڑ گئے

نشاطِ محفلِ لیل و نہار لوٹ لیا
نصیب میں غمِ لیل و نہار چھوڑ گئے

ہماری یاد بھلا کر وہ چل دیے اختر
اور اپنی یاد فقط یادگار چھوڑ گئے

اثر لکھنوی

غزل

مِلا کیا کہہ کے اک بار اے دلِ حسرت نشاں پھر بھی
تمنّا ہے کہ سُن لے کوئی تیری داستاں پھر بھی

جب اک مدّت کے بچھڑے دوست مل جاتے ہیں آپس میں
تو ہوگا اور ہوگا اتحادِ جسم و جاں پھر بھی

رہے جاتے ہیں ہر اک گام پر دو چار تھک تھک کر
رواں ہے سوئے منزل کارواں پر کارواں پھر بھی

سمجھتا ہوں دلِ ناشاد تڑپانے کی باتیں ہیں
وہ تجھ پر مہرباں کب تھا کہ ہوگا مہرباں پھر بھی

یوں ہی شاید قرار آئے یوں ہی شاد تسلّی ہو
کبھی تو اس طرف جا کر خیالِ بدگماں پھر بھی

ترے عارض پہ جس نے زلف کو بکھرا ہوا دیکھا
اسے حسرت رہی دیکھے وہی دلکش سماں پھر بھی

نشیمن جلتے دیکھا تھا اسے مدت ہوئی لیکن
نواحِ دل سے اٹھتا ہے تصور میں دھواں پھر بھی

"بلند و پست ہستی کو ہمیں ہموار کرنا ہے"
یہ دعویٰ اور آثر اندیشۂ سود و زیاں پھر بھی

اسرار الحق مجاز

★

حسن پھر فتنہ گر ہے کیا کہئے
دل کی جانب نظر ہے کیا کہئے

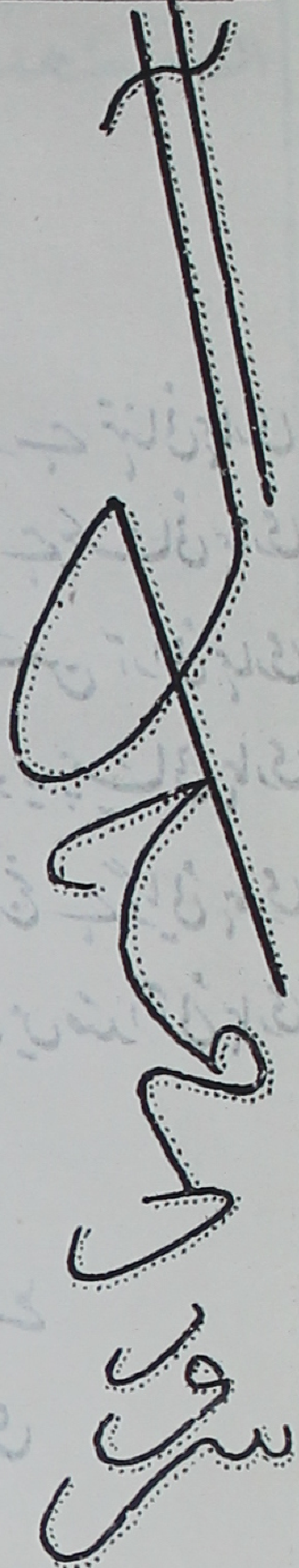
پھر وہی رہ گذر ہے کیا کہئے
زندگی راہبر ہے کیا کہئے

حسن خود پردہ در ہے کیا کہئے
یہ ہماری نظر ہے کیا کہئے

آہ تو بے اثر تھی برسوں سے
نغمہ بھی بے اثر ہے کیا کہئے

حسن ہے اب نہ حسن کے جلوے
اب نظر ہی نظر ہے کیا کہئے

آج بھی ہے مجاز خاک نشیں
اور نظر عرش پر ہے کیا کہئے



شانِ شعور نہ زلفِ شکن در شکن میں ہے
وہ بانکپن جو مسلکِ دار و رسن میں ہے

زینت نہ دو چمن میں پھول کھلائے تو بات ہے
یہ کیا بہار ہے جو مقید چمن میں ہے

جو انگبیں سمجھتا ہے جامِ حیات کو
اس کا علاج تلخیٔ کام و دہن میں ہے

میرا لہو بھی کام کچھ آ ہی گیا ضرور
شوخی بلا کی آج ترے پیرہن میں ہے

ہم انقلاب چاہیں تو بڑھ جائے کچھ جمود
فتنہ گری نئی یہ سپہرِ کہن میں ہے

شاید کبھی ہمارے قفس تک بھی آئے گی
نظارۂ بہار ابھی تک چمن میں ہے

عرفان و آگہی کے تقاضے بدل گئے
جادو عجیب اس نگہِ سحر فن میں ہے

سمجھائیں آج کس کو تسلسل حیات کا
دیکھو جسے اسیرِ جدید و کہن میں ہے

کیا دامِ خسروی سے رہا ہو نہ پائے گی
وہ سرکشی جو آرزوئے کوہکن میں ہے

تیرہ نظر اسے بھی سمجھتے ہیں اک غبار
تھوڑی سی روشنی جو سوادِ وطن میں ہے

پگھلے گی اے سرور ہمالہ کی برف بھی
طوفاں تلاشِ وادیٔ گنگ و جمن میں ہے

احمد ندیم قاسمی

★

اب ساری خدائی ہے تماشائی ہماری — کچھ روز سے آباد ہے تنہائی ہماری
محبوب اگر گل ہے تو ہم موسمِ گل ہیں — یکتائی محبوب ہے یکتائی ہماری
ہم ہٹ کے بھی دھرتی کے رگ و پے میں رواں ہیں — دیکھو تو ذرا انجمن آرائی ہماری
اب دامنِ صحرا یہ بھی دھوکا ہے چمن کا — اب ختم ہوئی بادیہ پیمائی ہماری
ہر لفظ میں ماضی کے کئی گیت گندھے ہیں — تاریخ کی اک گونج ہے گویائی ہماری
جو پھول کھلا، اس میں گھلا خون ہمارا — جو جام گرا اس میں صدا آئی ہماری

جب حریتِ فکر کا دستور ہوا طے
کہتے ہیں مشیت نے قسم کھائی ہماری

چمن پرست ہیں یہ رنگ و بو کے سوداگر
لہو خرید رہے ہیں لہو کے سوداگر

ان عصمتوں سے کہو ساتھ لے کے جھنکاریں
نکل پڑے ہیں کئی آبرو کے سوداگر

طریقِ سوداگری آج تک نہیں بدلا
بدل چکے ہیں مگر کو بکو کے سوداگر

ترا شباب سلامت مگر مرے ساقی
لہو بھی پیتے ہیں جام و سبو کے سوداگر

کبھی تو درد کے تاجر تھے اور ہم الطاف
فریب دیتے ہیں اب روبرو کے سوداگر

احسن رضوی داناپوری

کثافت آئینے کی حُسن کا جوہر دکھاتی ہے
تماشا ہے برائی میں بھلائی پائی جاتی ہے

نقاب اُلٹی تو ہے اس نے تماشا ہم بھی دیکھیں گے
کہ بجلی اب کہاں گرتی ہے کس کا گھر جلاتی ہے

نشاں جب کا نہیں کوئی وہ اس کا نام لیتے ہیں
وفا جب خاک ہوتی ہے تو پھر رنگ لاتی ہے

ستم اور صبر کا انجام یکساں ہو نہیں سکتا
رضا مشعل دکھاتی ہے ہوس اندھا بناتی ہے

نئی شہرت کی ضامن بن رہی ہے میری رسوائی
گریباں چاک کرتا ہوں تری آواز آتی ہے

جنہیں پامال کرنا چاہتی ہے فطرتِ گلچیں
اُنھیں توڑے ہوئے پھولوں کو دنیا سر چڑھاتی ہے

بکھر جائے گا دل کا چور اے ہنستے ہوئے غنچو!
نسیمِ صبحگاہی باغ کا چکر لگاتی ہے

غرض کا دَور ہے دنیا میں کڑوے گھونٹ پینا ہیں
تبسم کی حلاوت زہرِ غم میں گھولی جاتی ہے

خلوصِ دل نکھرتا جا رہا ہے چاند کی صورت
اُڑانے دو جہاں میں گر کدورت خاک اُڑاتی ہے

میں ہوں وہ یوسف کنعاں کہ میرے قتل نامہ پر
خود اپنے خون کی موجِ رواں مہریں لگاتی ہے

ہمکتا ہے جہاں دل شکوۂ بیداد کرنے کو
تمہارا نام آتا ہے وفا پہلو دباتی ہے

ہمارے کارواں کی گرد کو احسن نہ پہونچیگی
یہ دنیا دور سے کس واسطے غوغا مچاتی ہے

اعجاز صدیقی

★

ہو تشنہ لبی کچھ گردشِ عام سے آگے
ساقی سے قریب اور مے و جام سے آگے

وہ قافلے کیا سختیٔ جادہ سے ڈریں گے
منزل نظر آئے جنھیں ہر گام سے آگے

لینا ہی پڑا حسن کو آغوشِ نظر میں
جب بات بڑھی عشق پہ الزام سے آگے

تقدیر کا چکر ہی سہی، یہ پاؤں کا چکر
رکھنا ہے قدم گردشِ ایام سے آگے

جو کچھ ہے وہ ہے زندگیٔ گرم و رواں تک
کچھ بھی تو نہیں موت کے ہنگام سے آگے

اُس درد کو جانے ہے دلِ سوزِ طلب ہی
جو درد بڑھے لذتِ بے نام سے آگے

یہ درد بڑا دشمنِ اربابِ وفا ہے
کہتے نہ تھے اپنے دلِ ناکام سے آگے

کل بزم میں افسانے چھڑے تھے مرے غم کے
اک لفظ بھی نکلا نہ ترے نام سے آگے

اعجازؔ یہ اپنے دلِ محزوں کو بتا دو
ہے جنتِ آدم غم و آلام سے آگے

آنند نرائن مُلّا

روشنی صبح کے ڈوبے ہوئے تاروں میں نہیں
زندگی ڈھونڈھ مگر جا کے مزاروں میں نہیں

کشتیٔ دل کے مقدر میں یہ طوفاں کب تک
کیا کوئی جا تری نظروں کے کناروں میں نہیں

دل بجھائے ہوئے بیٹھے ہیں نگاہوں کے چراغ
روشنی کوئی محبت کے دیاروں میں نہیں

ابر بے آب سہی دھوپ کی تیزی تو گئی
میں نے مانا کہ ابھی کیف بہاروں میں نہیں

زد پہ موجوں کی نہ ہو کون ہے ساحل ایسا
امن موجوں میں نہیں ہے تو کناروں میں نہیں

جبر کی بند فضا امن کو آتی نہیں راس
گل یہ راہوں پہ مہکتا ہے حصاروں میں نہیں

عرصۂ شعر میں ہے شاہ سوار یکتا
نام ملّا کا مگر پانچ سواروں میں نہیں

اطہر ہاپوڑی

مژدۂ وصل اے دل اب وہ گلعذار آنے کو ہے
پھر مرے باغِ تمنا میں بہار آنے کو ہے

الفراق اے شدتِ دردِ جدائی الفراق
چارہ فرمائے مریضِ دل فگار آنے کو ہے

اضطرابِ ہجر کی شب اب سحر ہو جائے گی
اے دلِ بیتاب اب تجھکو قرار آنے کو ہے

غنچۂ خاطر مرا کھلنے کو ہے مانندِ گل
صحنِ گلشن میں نسیمِ مشکبار آنے کو ہے

ہے اثر یہ بھی مرے جذبِ کمالِ عشق کا
جو نہ آنے کو تھا وہ بے اختیار آنے کو ہے

آپ اطہر کس لئے ہیں آج اتنے شادماں
کیا پیامِ یار آیا ہے کہ یار آنے کو ہے

آل رضا

★

دل جلو کھل اٹھی ہنسی کیسی
اک دھوئیں میں یہ روشنی کیسی

آتشِ گل کے دھوکے دھوکے میں
آگ گلشن میں لگ گئی کیسی

اب محبت تری سوال پہ بھی
چپ ہی رہنے کی بے بسی کیسی

خوش ہوئے تھے کہ آگئی ہے بہار
دفعتہً رت بدل گئی کیسی

اُن سے جو بھی کہا کیا نہ گیا
کیا سے کیا بات ہو گئی کیسی

اے محبت کے اعترافِ شکست
بات ظالم نے پوچھ لی کیسی

حال پوچھا تو پھر سنا ہی نہیں
پھر کہو گے کہ بے رخی کیسی

تذکرے میں سیاہ خانوں پر
دُور ہی دُور روشنی کیسی

چاند کا دل تو صاف تھا ہم سے
پھیکی پھیکی ہے چاندنی کیسی

اب ذرا مسکرا کے دیکھیں تو
ہمکو آتی ہے اب ہنسی کیسی

ظرفِ دل ہی رضا جو ہو بھرپور
پھر کسی چیز کی کمی کیسی

اسرار لکھنوی

آنکھوں نے دل سے تو لیا کچھ اثر ابھی
لیکن کہاں وہ آبروئے چشمِ تر ابھی

کیوں احتیاط ہے نہ ہوں وہ جلوہ گر ابھی
کب ہم سے خود سنبھلتی ہے اپنی نظر ابھی

کیا جانے کیسا درد ہے کس قسم کا علاج
اک رنگ پر نہیں نگہِ چارہ گر ابھی

شاید نہیں ہے ان کی توجہ اسی لیے
رہتی ہے اپنے دل کی مجھے کچھ خبر ابھی

میری جبیں میں کتنی کمی ہے گداز کی
پتھر بنا ہوا ہے ترا سنگِ در ابھی

منزل سے کتنی دور ہوں منزل کے شوق میں
کیوں کر یہ شوق آئے سرِ رہ گذر ابھی

اب آگے بڑھ کے دن کی طرح دن جو ہو تو ہو
ہوتی ہے شام ہی کی طرح سے سحر ابھی

ایسے میں اندمال کی کوشش گناہ ہے
چھائی ہوئی ہے لذّتِ زخمِ جگر ابھی

مانا کہ ان کو خوب جمایا خیال میں
ہو سکتا ہے خیال مگر خوب تر ابھی

پھر کاروانِ شوق روانہ ہوا اسرارؔ
اور بیٹھنے نہ پائی تھی گردِ سفر ابھی

اختر انصاری

★

حواس و ہوش کی دنیا سے بیگانہ بنا ڈالا
بہاروں نے طبیعت کو یہ کس رستے پہ لا ڈالا

اترتی جا رہی ہیں زہر کی سی تلخیاں دل میں
یہ تم نے آج پیمانۂ نظر میں کیا ملا ڈالا

تمھاری بھول کے صدقے نہ بھولی دشمنی تم کو
تمھاری یاد کے صدقے ہمیں دل سے بھلا ڈالا

نگاہِ لطف پر خوش طالعی کا تھا گماں ہم کو
چلو اچھا ہوا تم نے وہ پردہ بھی اٹھا ڈالا

نہ اسکی صبح ہوتی ہے نہ اسکی شام ہوتی ہے
خبر بھی ہے کہاں ہے وہ جسے تم نے مٹا ڈالا

جن آنکھوں میں اک آنسو بھی نہ آیا جورِ گردوں سے
اُن آنکھوں تک کو ان اہلِ زمیں نے خوں رلا ڈالا

تجلی پر کمربستہ تجھے پایا تو اے تقدیر
ہمیں نے دونوں ہاتھوں سے جوانی کو لٹا ڈالا

یہ کیسی آگ ہے اختر کہ میرے دل کے کانوں میں
صدا پیہم یہ آتی ہے جلا ڈالا جلا ڈالا

انور صابری

جدید دور جو گلشن کو ساز گار آئے
کلی کلی کو ہنساتی ہوئی بہار آئے

اگر عنایتِ ساقی بروئے کار آئے
ادھر میں جام اٹھاؤں اُدھر بہار آئے

یہ کیا نظام محبت بنا لیا ہم نے
جو بات دل میں نہ ہو لب پہ بار بار آئے

میں اس کے وعدۂ فردا پہ کیوں یقین کروں
جسے نہ میری وفاؤں کا اعتبار آئے

کشاکش غمِ دنیا سے جب ملی فرصت
مزاج پوچھنے آلامِ روزگار آئے

مری حیات ہے سرمایۂ سکونِ جہاں
خدا کرے کہ زمانہ کو اعتبار آئے

بہار یک نظر و عیش یک نفس بے سود
بہار آئے تو یوں خالقِ بہار آئے

وہاں لطافتِ فطرت کا ذکر کیا انور
جہاں فسادِ طبیعت بروئے کار آئے

اقبال صفی پوری

٭

رگ رگ میں اس مست نظر کا کیف مجسّم آج بھی ہے
کتنے عالم بدلے لیکن اپنا وہ عالم آج بھی ہے

اُن کے غم کو کیوں اپنایا درد کو اپنا سمجھا کیوں
اتنی بات پر گردشِ دوراں مجھ سے برہم آج بھی ہے

کس پر وار کیا دنیا نے کوئی اسکو کیا سمجھے
چہرے تو ہنستے ہیں لیکن روح میں ماتم آج بھی ہے

اُن سے جب ٹکرائی تھیں نظریں اسکو زمانہ بیت گیا
دل کی تہہ میں ایک خلش سی بہم مبہم آج بھی ہے

سینکڑوں سورج ابھرے ڈوبے پھر بھی وہی ہے ربطِ جمال
پہلے بھی تھی پھول پہ شبنم، پھول پہ شبنم آج بھی ہے

سب کو یہ دولت نہیں ملتی غم ہے بقدرِ ظرف اقبالؔ
جسیں ہے کچھ ظرف کی وسعت اس کے لئے غم آج بھی ہے

اثرِ صہبائی

جو دل رہا ہے سوزِ غمِ جاوداں سے دور
کمبخت ہی ترے کرمِ بیکراں سے دور

الفت ہی ایک پھول ہے باغِ حیات میں
نیرنگئ طلسمِ بہار و خزاں سے دور

اپنی بلندیوں سے رہی خود بھی بے خبر
جبتک مری جبیں تھی ترے آستاں سے دور

وارفتگئ شوق و محبت کا کیا کہوں
دل اڑ رہا ہے سرحدِ کون و مکاں سے دور

خورشید و مہ سے بھی بہت آگے نکل گیا
لیکن ہنوز دل ہے ترے آستاں سے دور

نزدیک آ رہا ہوں تری بارگاہ سے
اب ہو گیا ہوں دسترسِ آسماں سے دور

صہبائی ایک مست ہے اپنے ہی رنگ کا
جام و نگار و مطرب و پیرِ مغاں سے دور

اکبر حیدر آبادی

غزل

روح کے لبوں پر بھی آ گئے ترانے سے
دل بھی مسکرا اٹھا تیرے مسکرانے سے

چھپ سکا نہ رازِ غم عشق میں چھپانے سے
خامشی کے بھی آخر بن گئے فسانے سے

ارتباطِ دیرینہ کب مٹا مٹانے سے
ہر نئے تصور کو ربط ہے پرانے سے

حُسنِ زندگانی کو اس طرح نکھارا ہے
لے لیا ہے بڑھ کر کچھ ہم نے ہر زمانے سے

اب وہاں منانا ہے جشنِ شیشہ و ساغر
مل سکا نہ اک قطرہ جس شراب خانے سے

نشہ میں ستم کے یہ بھول ہی گیا صیاد
رہ قفس کی ملتی ہے جا کے آشیانے سے

اہلِ غم کے سجدوں سے کس قدر عقیدت تھی
کھل گئی حقیقت سب میرے سر اٹھانے سے

سانحہ گلستاں کا بے مثال ہے اکبر
خونِ گُل ٹپکتا ہے فصلِ گُل کے آنے سے

اختر ہوشیار پوری

★

زمانہ اب بھی کچھ اس طرح مجھ کو تکتا ہے
کہ جیسے خار کسی آنکھ میں کھٹکتا ہے

ترے فراق میں پھر بھی سکون ملتا ہے
ترے حضور تو دل اور بھی دھڑکتا ہے

کہیں وہ درد نصیبوں کا آسرا تو نہیں
افق کے پاس ستارہ سا اک چمکتا ہے

اسی سے روشنی پائی ہے شامِ ہجراں نے
وہ ایک شعلہ رگ و پے میں جو بھڑکتا ہے

تو اس طرح سے نہ دیکھ ان ستم رسیدوں کو
جو تیری راہ میں گرتا ہے اٹھ بھی سکتا ہے

کوئی یہ جا کے خزاں کو خبر کرے اختر
اک اور پھول چمن میں ابھی مہکتا ہے

الم مظفرنگری

چمن ہو کہ صحنِ بیاباں جنوں کے ہر اک سمت پھیلے ہوئے سلسلے ہیں
اِدھر خار دامن سے الجھے ہوئے ہیں اُدھر گل سے بلبل کو شکوے گلے ہیں

زمانے کی تاریخ شاہد ہے اسکی نفاق و عداوت سے نفرت ہے ہمکو
صداقت پرستی سے ملنا ہمارا ملے جب کسی سے تو دل سے ملے ہیں

کچھ ایسی بھی آزادیاں ہیں کہ جن کی فضاؤں میں پھیلا ہے دامِ اسیری
بڑے پُرخطر ہیں وہ گوشے چمن کے جو بالکل قفس کی حدوں سے ملے ہیں

نہیں منزلِ عشق یہ اے مسافر بہ ہر رنگ جلوہ فریبِ نظر ہے
بعزمِ جواں گامزن ہو ابھی تو کئی مرحلے ہیں کئی قافلے ہیں

زمانے میں کیوں انقلاب آگیا ہے ہوا کس لئے نظمِ کونین برہم
نہ زلفیں پریشاں ہوئی ہیں کسی کی نہ گیسو ہوا سے کسی کے ہلے ہیں

جو سہہ جائیں گے آفتوں کو خوشی سے الم ہیں وہی کامیابِ دو عالم
زمانہ انھیں پیس ڈالے گا اک دن جو ہمت کے ہیٹے ہیں بزدلے ہیں

احمد ریاض

غزل

ہمارے دل نے شکست کھائی شکستِ جور و ستم سے پہلے
تمھارا غم راس آگیا ہے تمھارے حُسنِ کرم سے پہلے

خلوص کی انتہا کا منظر وفا کی شمعیں جلا رہا ہے
تمھیں بتا دو یہ رنگ تھا بھی تمھاری محفل میں ہم سے پہلے

اگر مجھے اپنی آرزوؤں کی ناتمامی کا علم ہوتا
تمام خوشیاں سمیٹ لیتا تری محبّت کے غم سے پہلے

یہ نفرتیں سربلند ہوں گی نہ شورشیں سرفراز ہوں گی
نہ جانے کتنا سکون ہوگا وجودِ دیر و حرم سے پہلے

ہر ایک رند اپنے اپنے حالات کے مطابق یہ سوچتا ہے
اجڑ گیا کیوں تمام مے خانہ گردشِ جامِ جم سے پہلے

سفینہ ڈوبا تو ناخدا کے فریبِ رنگیں کا جال ٹوٹا
یقین طوفان نہ تھا کسی کو بھنور کے اس پیچ و خم سے پہلے

غزل

احمد مشتاق

ترانۂ غمِ دل نغمۂ شبِ محزوں
سنے تو کون سنے اور کہوں تو کس سے کہوں

بڑے گلاب کی شاخیں پسند ہیں مجھ کو
مرا نصیب یہی ہے کہ دور سے دیکھوں

زمیں کی پیاس مرے آنسوؤں سے بجھتی ہے
مگر یہ بات گھرے بادلوں سے کیسے کہوں

یہ زرد شاخ مجھے کیوں اجاڑ دیتی ہے
اگر بہار نما ہو تو اس سے پوچھ ہی لوں

مرا وجود تو جب ہے کہ تم بھی ہو موجود
اب اپنے آپ سے باتیں کروں کہ تم سے کروں

کوئی ہزار کہے کوئی لاکھ سمجھائے
وہی کروں جو مرا دل کہے جو میں چاہوں

گلشن گلشن شعلۂ گل کی زلفِ صبا کی بات چلی
حرفِ جنوں کی بندِ گراں کی جُرم و سزا کی بات چلی

زنداں زنداں شورِ جنوں ہے موسمِ گل کے آنے سے
محفل محفل اب کے برس اربابِ جفا کی بات چلی

عہدِ ستم ہے دیکھیں ہم آشفتہ سروں پہ کیا گذرے
شہر میں اس کے بندِ قبا کی رنگِ حنا کی بات چلی

ایک ہوا دیوانہ اک نے سر تیشے سے پھوڑ لیا
کیسے کیسے لوگ تھے جن سے رسمِ وفا کی بات چلی

ٹوٹ گئیں نغموں کی طنابیں شعر کے خیمے راکھ ہوئے
بزمِ سخن میں جب بھی سلیمؔ اس شعلہ نوا کی بات چلی

برجموہن دتاتریہ کیفی

★

وہ جنوں قیس کا وہ جذبۂ منصور نہیں
ورنہ منزل گہہ دلدار تو کچھ دُور نہیں

نورِ وحدت نظر آجائے اگر تو نہ رہے
یہ وہ منظر ہے جہاں ناظر و منظور نہیں

نہیں تقدیر کی تحریر سے انکار مگر
اس میں تدبیر مقدر ہے جو مذکور نہیں

کل میں حل ہو کے رہے جُز کا اسی میں ہے وقار
خرد ناچیز ہے گر شاملِ جمہور نہیں

کیوں کھنچے رہتے ہیں یہ شیخ و برہمن باہم
دیر کعبہ سے جو حق پر ہو نظر دُور نہیں

ادب و شعر کا عالم ہے وہ وحدت آئین
کہ جہاں کافر و دیندار کا مذکور نہیں

حدِ جغرافیہ سے شعر کی دنیا ہے جُدا
دُور کیلاش سے دو گز بھی جہاں طور نہیں

کیف باقی ہے وہ اس میں کہ نہیں جسکو خمار
بادۂ شعر کوئی بادہ انگور نہیں

ساغر اک اور بھی اے پیرِ مغاں کیفی کو
نشۂ بے خودیٔ عشق میں وہ چُور نہیں

بیخود دہلوی

✱

عرش بن جائے نہ کیوں دل تری دیوانے کا
جام جمشید ہے خاکہ اسی پیمانے کا

مل گیا تھا کہیں منصور کو بھی روزِ ازل
ایک چھلکا ہوا قطرہ مرے پیمانے کا

میں ترے بول کو قاضی کا پیا دہ سمجھا
راز کس طرح سے کھلتا ترے مستانے کا

رازِ پوشیدۂ عالم کا پتہ دیتا ہے
جس پہ پڑجاتا ہے سایہ ترے دیوانے کا

وہ اچٹتی سی نگاہیں وہ مخالف باتیں
دوست بنکر بھی تو انداز ہے بیگانے کا

ایک منصور تھا ایک قیس وہ دونوں نہ رہے
قدرداں کون یہاں ہے مرے افسانے کا

ذکرِ مے سے کبھی بھرتا ہی نہیں جی بیخود
آپ لے لیجئے ٹھیکہ کسی میخانے کا

بہزاد لکھنوی

★

صبح ہوئی چلی نسیم صبح کا ماجرا نہ پوچھ
رات تو خیر کٹ گئی صبح کو کیا ہوا نہ پوچھ

رازِ جمالِ آفتاب ذرے سمجھ سکیں گے کیا
میں ہوں کہ تو ہے حسنِ دوست کون ہے خود نما نہ پوچھ

رہنے دے یوں ہی راز میں نازو نیاز عاشقی
اپنا بھی ماجرا نہ کہہ میرا بھی ماجرا نہ پوچھ

اس کے ہر ایک ذرہ میں کعبے ہیں لاکھ جلوہ گر
میری جبینِ شوق سے رفعتِ نقشِ پا نہ پوچھ

غم سے یوں ہی تباہ کر نالہ نہ کر نہ آہ کر
عشق کی ابتدا ہے یہ عشق کی انتہا نہ پوچھ

بہنے دے کشتیٔ مراد رہنے دے اپنے دل کو شاد
حسرتِ ناخدا ہے کیا حسرتِ ناخدا نہ پوچھ

آنکھ میں اشکِ غم ہے کیوں دامنِ شوق نم ہے کیوں
ہائے غم شکستگی غم کا معاملہ نہ پوچھ

باقر مہدی

غزل

طوفانوں سے ٹکر لی تھی یہ تو کنارہ جانے ہے
ساحل پر ہم ڈوب رہے ہیں کیا یہ دھارا جانے ہے

نام ہمارا جب آتا ہے تم خوش رہ کر چپ ہوتے ہو
کہنے کو یہ راز ہے لیکن عالم سارا جانے ہے

یہ دنیا ہے دیوانوں سے بزم سجی ہے پروانوں سے
شمع ہو تم یہ بات نہ مانو دل تو تمھارا جانے ہے

شہروں شہروں ملکوں ملکوں آوارہ ہم پھرتے ہیں
راہِ وفا کا ذرہ ذرہ نام ہمارا جانے ہے

دل کی جیتیں دل کی ماتیں جادوگر کی ساری باتیں
شام کا تارا جانے نہ جانے صبح کا تارا جانے ہے

کچے دھاگے ٹوٹ چکے ہیں کتنے ساتھی چھوٹ چکے ہیں
جانے کیوں دل اب تک تم کو اپنا سہارا جانے ہے

میر ہوئے تھے کل دیوانے آج ہوئے ہیں ہم دیوانے
غزلوں کی یہ دنیا انجام ہمارا جانے ہے

باقرؔ کب تک خون تھوکو گے مرنے کی تدبیریں سوچو
کس کی خاطر جیتے ہو یہ دل ہی تمھارا جانے ہے

برق عظیم آبادی

★

غم کے آغاز کا انجام ابھی باقی ہے
صبح رو دھو کے کٹی شام ابھی باقی ہے

دفترِ غم میں مرا نام ابھی باقی ہے
مٹ گیا دل مگر الزام ابھی باقی ہے

آس کہتی ہے کہ لے دیکھ لے میرا انجام
یاس کہتی ہے مرا کام ابھی باقی ہے

بھولنے والے ترے طرزِ تغافل کی قسم
حسرتِ نامہ و پیغام ابھی باقی ہے

آکے پیمانے لبوں تک جو چھلک جاتے ہیں
رعشۂ گردشِ ایام ابھی باقی ہے

شمع تھرا کے بجھی صبح نمودار ہوئی
رونقِ بزم گئی نام ابھی باقی ہے

صحنِ گلزار میں اے برق نشانی کی طرح
تنکے تنکے پہ ترا نام ابھی باقی ہے

★

بیجر لال جگی رعنا

★

اداس دل میں نئی امیدوں کے جام و ساغر چھلک رہے ہیں
بہت غنیمت ہیں تیرگی میں جو چند شعلے بھڑک رہے ہیں

ہوائے غم کیا چلی دلوں کے فسردہ غنچے چٹک رہے ہیں
ہے دور دورہ خزاں کا لیکن کہیں کہیں گل مہک رہے ہیں

زہے فسونِ طلب کہ سپنوں نے بھی حقیقت کا روپ دھارا
نظر سے پنہاں تھے جو نظارے نظر کے آگے چمک رہے ہیں

بلند فطرت ہیں جو ازل سے نہیں کسی سے بھی پست ہوتے
کبھی گرے بھی جو وہ زمیں پر تو مثلِ اوجِ فلک رہے ہیں

یہ دل کا نازک سا آئینہ بھی بڑے قیامت کا آئینہ ہے
کوئی مقابل نہیں ہے لیکن ہزار جلوے جھلک رہے ہیں

کبھی جو تھے جان و رنگ و نکہت کبھی جو تھے روحِ باغِ جنت
وہی گل اب باغباں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہے ہیں

نہ پوچھئے کچھ فریب کیا کیا دیے ہیں ہم دردجانے دل کو
ابھی گھٹائیں برس رہی تھیں ابھی ستارے چمک رہے ہیں

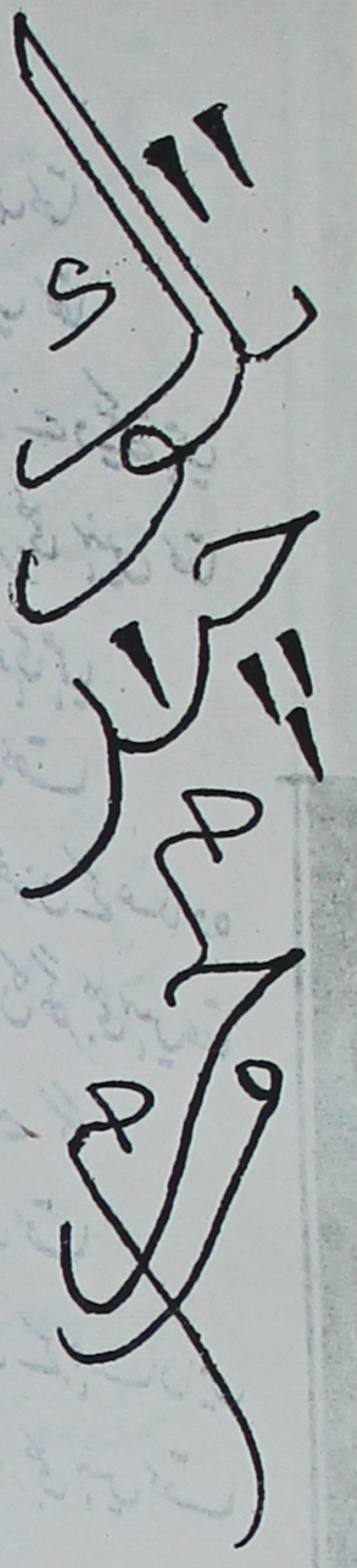
نفس نفس میں خیال اُن کا نظر نظر میں جمال اُن کا
حیات کے راستوں پہ رعنا قدم قدم پر اٹک رہے ہیں

پیارے لال شاکر

★

محبت جو عینِ حقیقت نہیں ہے — حقیقت یہ ہے وہ محبت نہیں ہے
سکوں کا سبب جز محبت نہیں ہے — محبت نہیں تو مسرت نہیں ہے
جو مانوس غمہائے ہر دو جہاں ہیں — اُنھیں کچھ بھی غم کی شکایت نہیں ہے
میں روتا ہوں رونا ہی فطرت ہے میری — کسی سے مجھے کچھ شکایت نہیں ہے
زمانے کی بے التفاتی کا شکوہ — زمانے کو میری ضرورت نہیں ہے
ازل سے طلبگار ہوں رنج و غم کا — مجھے آرزوئے مسرت نہیں ہے
مٹا دے مرا نقشِ ہستی مٹا دے — مجھے زندگی کی ضرورت نہیں ہے
محبت کی مجبوریاں اللہ اللہ — تڑپنے کی بھی یاں اجازت نہیں ہے
نہ ذرّوں کو چشمِ حقارت سے دیکھو — یہاں کوئی شے بے حقیقت نہیں ہے
جسے اپنا سمجھو وہ بنتا ہے دشمن — زمانے میں قدر و محبت نہیں ہے
تری بے نیازی نے سب دے دیا ہے — کسی چیز کی مجھ کو حسرت نہیں ہے
سرِ رہ گزر ذرّۂ خاک ہوں میں — بجز اس کے میری حقیقت نہیں ہے

اُسے جو بھی دینا ہے وہ دیگا شاکر
ہمیں مانگنے کی ضرورت نہیں ہے



کچھ بُری بات نہیں صاحبِ ایمان ہونا
اگر ایمان سے مطلوب ہو انساں ہونا

برگ ہائے گلِ تر کا یہ پریشاں ہونا
جُرم ہے گل کدۂ دہر میں خنداں ہونا

جب کسی غنچے کو کھِلتا ہوا دیکھا میں نے
آگیا یاد وہیں دل کا پریشاں ہونا

ہوگیا میری پریشاں نظری کا باعث
جلوۂ حُسن کا ہر سمت فراواں ہونا

اہلِ وحشت کا ٹھکانا بھی کہیں تو ہوتا
نہیں بے صرفہ بیاباں کا بیاباں ہونا

دم غمِ عشق کا بھرتے ہوئے نالے کرنا
آرزو درد کی اور طالبِ درماں ہونا

باعثِ حیرتِ اربابِ سخن ہے محروم
عہدِ پیری میں تمھارا یہ غزل خواں ہونا

تیغ الہ آبادی

وہاں میں نے روداد غم ڈھونڈ لی ہے، جہاں نالۂ مختصر بھی نہیں تھا
میں ایسے افق چھو کے آیا ہوں جن پر تخیل کو اذنِ سفر بھی نہیں تھا

پس و پیش یوں میرے قدموں کی آہٹ کو اب اجنبی آنکھ سے دیکھتے ہیں
کہ جیسے یہ وہ راہ ہے جس پہ کوئی مرے پیار کا منتظر بھی نہیں تھا

یہ سچ ہے کہ ان آنسوؤں کی چمک میں وہ راتیں وہ صبحیں ابھرتی رہی ہیں
شب و روز کا یہ چراغاں مگر اک تری یاد پر منحصر بھی نہیں تھا

ترے شہر کے اور بھی واقعے تھے، ترے پیار کی الجھنوں کے علاوہ
وہاں وضعداری کی بات آ گئی تھی جہاں چار تنکوں کا گھر بھی نہیں تھا

مجھے سوزِ دل کی اجازت عطا کر نہیں تو زمانہ ہمیشہ کہے گا
نگارِ سحر ترے ماتھے کی بیندی میں تھوڑا سا خونِ جگر بھی نہیں تھا

اسی روزمرہ کی دنیا میں ہم ایسے کچھ رند بھی تھے کہ جن کے جہاں میں
کچھ افواہ سود و زیاں بھی نہیں تھی کچھ اندیشۂ بام و در بھی نہیں تھا

زمانہ بدستور ہستا رہے گا، زمیں حسب معمول چلتی رہے گی
اکیلے سفر کا اکیلا مسافر اس انجام سے بےخبر بھی نہیں تھا

تنویر نقوی

غزل

کچھ ایسی ہوا صحنِ گلستاں میں چلی ہے
گوشے میں نشیمن کے بھی آرام نہیں ہے

اس گردشِ زر نے ہمیں برباد کیا ہے
کچھ تیری خطا گردشِ ایّام نہیں ہے

ہم رنگِ زمیں دام ہی کیوں تو نے بچھائے
صیّاد! پرندوں کی نظر خام نہیں ہے

کس شوق سے بھر بھر کے پلاتے ہیں عدو کو
اور کہتے ہیں گردش میں ابھی جام نہیں ہے

ہر سمت اندھیروں نے جو گھیرا ہے تو کیا ہے
ہوگی وہ سحر جس کی کوئی شام نہیں ہے

یہ فن یہ ہنر تو میری محنت کا ثمر ہے
ہر شعر میں آورد ہے الہام نہیں ہے

جوش ملیح آبادی

★

وہ درد کے دن باقی نہ رہے درماں کی وہ راتیں بیت گئیں
دل تھام کے جن میں روتے تھے ہجراں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو خوف سے آہیں بھرتی تھیں آغوش میں آتے ڈرتی تھیں
جو چھپ کے چراغاں کرتی تھیں افشاں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو حسن جواں سے رخشاں تھیں وہ مصر کی صبحیں شام ہوئیں
جو بوئے قبا سے رقصاں تھیں کنعاں کی وہ راتیں بیت گئیں

ہر آہ میں اک بربط غلطاں ہر ٹیس میں اک لذت رقصاں
سو عیش کے دن جن پر قرباں حرماں کی وہ راتیں بیت گئیں

گھنگھور اندھیرا چھایا ہے ارماں کے جواہر خانے میں
نیلم کی شعاعیں خاک ہوئیں مرجاں کی وہ راتیں بیت گئیں

خود ایماں جن سے تاباں تھا وہ کفر کا سورج ڈوب گیا
خود عصمت جس پر نازاں تھی عصیاں کی وہ راتیں بیت گئیں

خطبے تھے مغاں کے معبد میں سجدے تھے بتوں کے قدموں پر
ایماں کے وہ دن برباد ہوئے عرفاں کی وہ راتیں بیت گئیں

وحشت کے جزیرے ڈوب گئے پھولوں کی سواری دور گئی
صبحیں وہ گریباں کی نہ رہیں داماں کی وہ راتیں بیت گئیں

دل جوش دھڑکتا رہتا تھا جب زلف سیہ کے حلقوں میں
وہ قید کے دن باقی نہ رہے زنداں کی وہ راتیں بیت گئیں

جگر مرادآبادی

حسن کے نغمے بھی خاموشِ فغاں تک پہنچے
اب ترے حوصلے اے عشق کہاں تک پہنچے

جب ہر اک شورشِ غم ضبطِ فغاں تک پہنچے
پھر خدا جانے یہ ہنگامہ کہاں تک پہنچے

آنکھ تک دل سے نہ آئے نہ زباں تک پہنچے
بات جسکی ہے اسی آفتِ جاں تک پہنچے

بڑھ کے رندوں نے قدم حضرتِ واعظ کے لئے
گرتے پڑتے جو درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

تو جہاں پر تھا بہت پہلے وہاں آج بھی ہے
دیکھ رندانِ خوش انفاس کہاں تک پہنچے

جو زمانے کو بُرا کہتے ہیں خود ہیں وہ بُرے
کاش یہ بات ترے گوشِ گراں تک پہنچے

تو مرے حالِ پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

مرے اشعار میں جو آگ دبی ہے اے کاش
تجھکو راس آئے ترے عزمِ جواں تک پہنچے

انکو جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جلوے بیتاب تھے جو پردۂ فطرت میں جگر
خود تڑپ کر مری چشمِ نگراں تک پہنچے

جمیل مظہری

کہے گا خود نقش پائے ہمت قدم قدم پر مرا فسانہ
میں وہ مسافر ہوں جس کے پیچھے ادب سے چلتا رہا زمانہ

کھڑی ہوئی ہے قطار باندھے یہاں مجبوت بھی مجبر مانہ
اجڑ گئیں ساری بارگاہیں بدل گیا سارا کارخانہ

مجھے بھی تھوڑی سی تشنگی دے کہ توڑ دوں یہ شراب خانہ
نہ وہ ہوس کے قمار خانے نہ وہ خرد کا نگار خانہ

سیاہ زلفیں بڑھا رہی ہیں تجلیاں کر رہی ہیں شانہ
فسانے بننے لگے حقیقت حقیقتیں بن گئیں فسانہ

خدا و ابلیس کی شراکت میں چل رہا ہے یہ کارخانہ
جرس کی آواز کہہ رہی ہے کہ قافلہ ہو چکا روانہ

تجھے خبر اغو لہا ہیں رہ روشنی ہر نشیلی آنکھوں کی نیند اڑی ہے
جمیل کی بانسری نے چھیڑا ہے شام سے صبح کا ترانہ

جگر بریلوی

دل نہ دیوانہ ہو یہ شکوہ گوارا بھی نہیں
چاکِ دامان و گریباں ہوں یہ ایما بھی نہیں

جان بیتاب سی رہتی ہے کہ ہو جائے نثار
آنکھ بھر کر ابھی تم نے اُسے دیکھا ہی نہیں

زخم بڑھتا بھی نہیں فیصلہ جس سے ہو جائے
تیر وہ دل میں لگا ہے کہ نکلتا ہی نہیں

بے حجابی بھی نہیں وہ کہ جو ہوش اڑ جائیں
ہوش رہ جائیں ٹھکانے ہی وہ پردا بھی نہیں

پاؤں رُکتے ہی نہیں آپ بڑھے جاتے ہیں
ہم کو اس کوچے کا سودا ہو تو سودا بھی نہیں

شکوۂ جور تو کرتے ہیں مگر سچ یہ ہے
لطف ہم پر ہو جب اگر تم نے یہ چاہا بھی نہیں

جاں نثار اختر

کبھی چمن کی لطافت بھی بار گذری ہے
نظر پہ پھول کی رنگت بھی بار گذری ہے

ہوا ہے دل میں وہ شعلہ کبھی کبھی روشن!
کہ چاندنی کی صباحت بھی بار گذری ہے

کبھی کسی کی متانت سے دم بھی اُلجھا ہے
کبھی کسی کی شرارت بھی بار گذری ہے

وہ انہماک رہا کاروبارِ دل میں کبھی
کہ سانس لینے کی فرصت بھی بار گذری ہے

کبھی خود اُن کی وفا سے ہوا ہے دل بیزار
کبھی خود اُن کی محبت بھی بار گذری ہے

کبھی رہا ہوں میں اس درجہ بے سروساماں
کسی کی چشمِ عنایت بھی بار گذری ہے

غمِ جہاں کو کبھی ہمتوں نے اپنایا
کبھی خود اپنی مسرت بھی بار گذری ہے

کبھی نظر جو اٹھائی ہے آدمیت نے
جبیں پہ مہرِ شرافت بھی بار گذری ہے

کبھی طلسمِ فریبِ خیال یوں ٹوٹا
کہ زندگی کی صداقت بھی بار گذری ہے

کسی کی یاد قیامت سہی مگر اختر
کبھی کبھی یہ قیامت بھی بار گذری ہے

جرم محمد آبادی

★

ٹھہری موجیں بہتا دھارا — اُن کی ضد اور شوق ہمارا
جب چھونا ہے جا کے کنارا — کیسی موجیں کیسا دھارا
بوجھ گیا میں اُن کی پہیلی — وہ ہیں سمجھے میرا اشارا
ڈوبنے والے دیکھ چکے ہیں — ساحل، کشتی، موجیں، دھارا
اِک عالم غم خوار تھا لیکن — کام نہ آیا کوئی سہارا
ساتھ اُسی نے پہلے چھوڑا — جس پر تھا کچھ زور ہمارا
چلتے چلتے رک گئیں نبضیں — بہتے بہتے ٹھہرا دھارا
کیونکر اُن کو حال سناؤں — کشتی سے ہے دور کنارا
مرتے دم تک خوش رہنے کو — کافی ہے بس ایک اشارا
آ گئی دل کی بات زباں تک — رک نہ سکا جذبات کا دھارا

جرم یہ ہے رودادِ محبت
ٹپکے آنسو، ٹوٹا تارا

جگناتھ آزاد

کیا تمنائے دلِ خاک ہے خاموش رہو
آج ماحول خطرناک ہے خاموش رہو

دردِ سینہ کا سبب اس کا ہے یا جوشِ بہار
کس لئے سینۂ گل چاک ہے خاموش رہو

رازدار و یہ کہیں راز نہ رسوا ہو جائے
کس لئے دل مرا غمناک ہے خاموش رہو

نطقِ بے باک زمانے میں بڑی شے ہے مگر
وقت کچھ اور بھی بے باک ہے خاموش رہو

عنبر و عود کا ہر سمت دھواں ہے ورنہ
یہ فضا آج بھی ناپاک ہے خاموش رہو

جمیل ملک

وہ سمجھتے ہیں ہمیں ان کی جفا یاد نہیں
یوں ہی خاموش ہیں ورنہ ہمیں کیا یاد نہیں

جانے کیا بیت رہی ہے ترے دیوانوں پر
ان دنوں ان کو تری کوئی ادا یاد نہیں

ہم نے جاں دے کے خدائی کا بھرم رکھا ہے
پھر بھی شکوہ ہے انھیں ہم کو خدا یاد نہیں

وہ مرا پیار تو کیا یاد تجھے آئے گا
تجھ کو اپنی بھی کوئی خاص ادا یاد نہیں

اس طرح ڈوب گیا ہوں تری رعنائی میں
جیسے کچھ بھی تو مجھے تیرے سوا یاد نہیں

اُن سے تو زیست بھی کترا کے نکل جاتی ہے
جن کو اس دور میں جینے کی ادا یاد نہیں

ایک ہم ہیں کہ ہوئے مفت میں بدنام جمیل
ایک وہ ہیں کہ جنھیں اپنی خطا یاد نہیں

حسرت موہانی

★

دل اُن سے مل کے اب اُن کو بھلا نہیں سکتا
مگر یہ کیوں ہے میں خود بھی بتا نہیں سکتا

بقدرِ حوصلۂ عاشقی ہے شوقِ وصال
مگر وہ شوق جو دل میں سما نہیں سکتا

یہ کس کے عجزِ تمنا کا پاس ہے کہ وہ شوخ
بزعمِ ناز بھی دامن چھڑا نہیں سکتا

تری نظر کا ہے ناوکِ وہ ناوکِ دل دوز
نشانہ کوئی بھی جس کا بچا نہیں سکتا

اُنھیں یقینِ محبت نہیں غضب تو یہ ہے
کہ چیر کر میں دل اپنا دکھا نہیں سکتا

اگرچہ میں ہمہ تن درد ہوں مگر حسرت
کوئی جو پوچھے کہاں ہے بتا نہیں سکتا

وحشت سی فضاؤں میں ہر چار طرف چھائی
پھر دل پہ نہیں قابو شاید کہ بہار آئی

ایوانِ خرد کی پھر ہلنے لگیں بنیادیں
عالم میں ہوا پیدا شاید کوئی سودائی

نقشہ ہے بھری محفل ویرانیٔ صحرا کا
میرے دلِ وحشی کی اللہ رے تنہائی

مُنہ بند کروں جا کر کس کس کا جہاں بھر میں
بدنامی سی بدنامی رسوائی سی رسوائی

رنگینی و خود بینی ہے حُسن کی فطرت میں
وہ قوسِ قزح نکلی لیتی ہوئی انگڑائی

نعمت سے خرد کی ہے محروم یہ ویرانہ
اے ہم نفسو سارا سنسار ہے سودائی

رکھتے ہیں تعلق کچھ سوزِ دلِ محزوں سے
شعلے ترے دامن کے اے لالۂ صحرائی

دن ہم نے گزارا ہے کیا کہئے کس آفت سے
اب ہجر کی رات آئی آگ اور بلا آئی

مجمع ہے خیالوں کا نغموں کی فراوانی
ہے ایک بھری محفل افسر مری تنہائی

منت گزارِ جلوہ مذاقِ نظر نہیں
لیکن اسیرِ شوق کو اسکی خبر نہیں

حاصل اگر متاعِ غمِ معتبر نہیں
ہے زندگی وہ رات کہ جسکی سحر نہیں
شایانِ دیدِ حسن جو ذوقِ نظر نہیں
آئینہ پرتوِ رخِ آئینہ گر نہیں
پنہاں ہے بے رخی میں تری طرزِ جاں ستاں
اس لطفِ خاص کی تو کسی کو خبر نہیں
کیا غم اگر بلند ہے بامِ حیاتِ نو
پروازِ شوق معتقدِ بال و پر نہیں
طے کر رہا ہوں جادۂ ہستی کی منزلیں
لیکن قبائے شوق پہ گردِ سفر نہیں

حسن عظیم

ہوں میں حسنؔ رفیقۂ حسنِ غم نواز
اپنی شبِ فراق رہینِ سحر نہیں

خلیل الرحمن اعظمی

★

بہت فسردہ ہیں اُن کو کھو کر جگر فگاروں سے کچھ نہ کہنا
نہ جانے کیا اُن کے دل پہ بیتے گی سوگواروں سے کچھ نہ کہنا

بہت ہی بھوکے بہت ہی مفلس بڑی ہی آوارہ گرد ہیں ہم
بڑے ہی سرکش ہیں جانے کیا کہہ دیں غم کے ماروں سے کچھ نہ کہنا

کبھی نہ بھولیں گی ایسی گھڑیاں یہ سخت تنہائیوں کے لمحے
گذارنی ہجر کی یہ راتیں مگر ستاروں سے کچھ نہ کہنا

جو تیری ساقی گری یہ اکتا کے میکدہ سے نکل گئے ہیں
وہ اپنا حق چھین لیں گے اب ایسے میگساروں سے کچھ نہ کہنا

یہ دردِ غربت یہ اشک پیہم یہ اجنبی سحر کی ہوائیں
مگر وہ جو میرا حال پوچھیں تو میرے پیاروں سے کچھ نہ کہنا

خمارؔ بارہ بنکوی

★

نگاہِ دوست بھی دل پر گراں معلوم ہوتی ہے
محبت اب غبارِ کھ جواں معلوم ہوتی ہے

جھلکتا تو ہے میرے آنسوؤں میں دکھ مرا لیکن
جو سچ بیتی ہے مجھ پر وہ کہاں معلوم ہوتی ہے

ازل سے کہہ رہے ہیں عشق کی روداد سب لیکن
ابھی تک ابتدائے داستاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میرے ہی گذرے ہوئے لمحاتِ رنگیں کی
مجھی کو اب حدیثِ دیگراں معلوم ہوتی ہے

نظر یوں تو نظر کے ماسوا کچھ بھی نہیں لیکن
اُتر جاتی ہے جب دل میں سناں معلوم ہوتی ہے

نگاہیں پھر چکیں اُن کی وفائیں ہو چکیں رسوا
خمارؔ اب زندگی بارِ گراں معلوم ہوتی ہے

رضا علی وحشت

غزل

نہ مجھ کو امید ہے کسی سے نہ مجھ کو اندیشہ ہے کسی کا
مزے سے اپنی گزر رہی ہے بھلا ہو اس بے تعلقی کا

اگر کبھی کوئی کام کرنا تو مجھ کو ڈنکے کی چوٹ کہنا
نہیں کوئی بات راز میری یہ راز ہے میری زندگی کا

روش زمانے کی دیکھتا ہوں خوشی مجھے ہو تو کس طرح ہو
وہی مرے رونے کا محل ہے محل جو اوروں کی ہے ہنسی کا

نصیحتِ ترکِ عشق اس کو ہے شیوہ جس کا وفا شعاری
کوئی یہ احباب سے تو پوچھے یہ کون موقع ہے دل لگی کا

مشاعروں میں غزل سرائی نہیں مجھے اب پسند وحشت
نئے ہیں اندازِ شاعری کے بدل گیا رنگ شاعری کا

راہی معصوم رضا

★

نظامِ زلفِ عالم میں جہاں بھی برہمی آئی
شعورِ فن کے حصے میں وہاں شائستگی آئی

غموں کے تیز اندھیرے سے خوشی کی روشنی آئی
ہوا ہے چاک جب دامن تو کلیوں کو ہنسی آئی

تبسم ان دنوں تخلیق ہی کی طرح مشکل ہے
بڑی مشکل سے آئی جب بھی ہونٹوں پر ہنسی آئی

ہوائیں چیر کر دھندلکا دلِ گلشن سجائینگی
خزاں سنبھلے کہ اب تخلیقِ غنچہ کی گھڑی آئی

بڑی محنت سے دیوانوں نے یہ تلوار پائی ہے
محبت کی حفاظت کے لئے نفرت چلی آئی

اجل کے سخت پہرے میں اکیلا تو نہیں چھوڑا
دلوں تک آس میں تحلیل ہو کر زندگی آئی

یہ سچ ہے جانتے ہیں آج فرقِ رہبر و رہزن
مگر راہی بہت کچھ کھو کے یہ فرزانگی آئی

سب میکش جی بھر پی لیں باہم دورِ جام رہے
رہتی دنیا تک اے ساقی میخانے کا نام رہے

پھرتے ہیں اب بستی بستی جیسے کوئی کام نہیں
جب تک تیرے شہر میں تھے ہم دنیا بھر کے کام رہے

بادِ صبا کی باتیں سن کر کس کو آ سکتا تھا یقین
پھر بھی کل سے آج سوا ہم مشتاقِ پیغام رہے

روئے صنم کو مصحف سمجھا ابرو کو محرابِ نماز
کعبے والو دیر میں بھی ہم پابندِ اسلام رہے

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک کیا ایفا ہو وعدۂ دوست
لب پہ ترے اے کشتۂ فردا صبح رہے یا شام رہے

جام لبوں تک لا کر ساقی دانستہ توڑا ہم نے
ترا تغافل سر آنکھوں پر تجھ پر کیوں الزام رہے

ہم نے اگر کچھ رنگ اڑائے اس میں بری کیا بات ہوئی
وہ بھی ہے جو اپنی خوشی سے مانوسِ آلام رہے

منزل سے بیگانہ ہو کر دل کو تیری راہ ملی
جن کا رخ سوئے منزل تھا آخر وہ ناکام رہے

لاکھ اٹھے طوفانِ ملامت لیتے ہیں اے پاسِ وفا
حسن پہ کوئی بات نہ آئے عشق پہ ہر الزام رہے

اہلِ جہاں کی تنگ دلی سے کیا مطلب ہے ہم کو [illegible]
آزادوں کی وضع یہی ہے کام سے اپنا کام رہے

ہاتھ جکڑے ہیں اور زباں خاموش
زندگی کی ہے داستاں خاموش

کس سے پوچھیں حکایت منزل
رہنما چپ ہیں کارواں خاموش

کس جگہ جائیں آشیاں برباد
شاخ افسردہ گلستاں خاموش

جانے افتاد کیا پڑی ہے آج
ہو گئے سارے رازداں خاموش

جن سے قائم تھی گرمیٔ محفل
جانے وہ لوگ ہیں کہاں خاموش

تلخ حصے تھے وہ فسانے کے
ہم ہوئے ہیں جہاں جہاں خاموش

ایسا کیا حادثہ ہوا ہے رضا
ہیں جو سب اہلِ گلستاں خاموش

رضا ہمدانی

نام لے لے کے نہ پوچھ اہلِ بیاباں سے مجھے
آج پہچان مرے چاکِ گریباں سے مجھے

لاگ ہے نغمگیٔ محفلِ امکاں سے مجھے
تیری آواز سی آتی ہے رگِ جاں سے مجھے

بے قراری مری فطرت تو نہیں ہے لیکن
دیکھئے ہٹ کے حدودِ شبِ ہجراں سے مجھے

چار تنکوں کے تعلق نے مٹا رکھا ہے
یہ غلط ہے کہ محبت ہے گلستاں سے مجھے

کبھی دامن مرے ہاتھوں سے جھٹک دیتے تھے
جو ہوا دیتے ہیں اب گوشۂ داماں سے مجھے

ابھی آزاد ہوں اے سلسلۂ وحشتِ عشق
ابھی زنجیر بلاتی رہے زنداں سے مجھے

نہ زمانہ سے کہیں رسمِ عبادت اٹھ جائے
کیوں اُٹھاتا ہے زمانہ درِ جاناں سے مجھے

شکر سجدہ کہ سپاسِ غمِ دل ہو رعنا
نعمتیں کتنی ملی ہیں درِ جاناں سے مجھے

زہرہ نگاہ

غزل

مسکراتے ہی ہر آنکھ بھر آئی ہے
کس ادا سے نسیم سحر آئی ہے

کچھ نئے راستے بھی وعدہ یار مل گئے
جب کبھی کوئی منزل نظر آئی ہے

دیکھ کر اپنے گلشن کی بربادیاں
لالہ و گل پہ سرخی نکھر آئی ہے

رہ گذر کھو گئی ہم سفر کھو گئے
تجھ کو اب یادِ راہبر آئی ہے

ان کو سجدے کریں گی یہی منزلیں
جن کی قسمت میں گردِ سفر آئی ہے

سیماب اکبر آبادی

کبتک یونہی حجاب کی تہمت لگائیں گے
پردے اُٹھانے والے نظر بھی اُٹھائینگے

ہر ذرّۂ چمن ہے ہماری ہی یادگار
جبتک بہار آئے گی ہم یاد آئینگے

میں منتظر ہوں ظرفِ تماشا لئے ہوئے
دیکھیں سوا وہ کس کی نظر آزمائینگے

تدبیر آزما ہوں بہ تقدیرِ انقلاب
مجھ کو یقین ہے کہ یہ دن پھر نہ آئینگے

ہے سایۂ سکون تپش دل کیساتھ ساتھ
پھیلی ہوئی ہے دھوپ تو بادل بھی چھائینگے

ہوں درد آشنا میری پرواز ہے بلند
دھوکے حیات کے مجھے چھونے نہ پائینگے

اِک روز کھل ہی جائے گا اُن پر مذاقِ عشق
ہم دل کی بات دل سے کہانتک چھپائینگے

اس دور نے بنائے ہیں جتنے نئے غلام
اتنے کئی صدی میں بنائے نہ جائینگے

شامِ چمن ہو یا ہو چراغِ سوادِ طور
دل جن کے ہیں بجھے ہوئے کیا مسکرائینگے

سنتے ہیں اُن کا جلوہ ہے مقسومِ ہر نگاہ
ہم بھی کبھی نصیبِ نظر آزمائینگے

ہے رہروانِ جادۂ ہستی سر کیوں غبار
اس راستے میں پھر یہ مسافر نہ آئینگے

دل ہے چراغِ خانۂ مفلس نہ توڑ اسے
پھر غم کی رات آئی تو ہم کیا جلائینگے

نطقِ کلیم سے ہوئی بیدار شمعِ طور
سیماب ہم بھی تابِ سخن آزمائینگے

سکندر علی وجد

★

اے جاں ترے جلوے کے برابر ہے تری یاد
سامانِ سکونِ دلِ مضطر ہے تری یاد

لائی ہے صبا آج تری زلف کی خوشبو
گل ہائے مسرت سے معطر ہے تری یاد

پھرتی ہیں نظر میں تری مستانہ ادائیں
پُر کیف خیالات کا محور ہے تری یاد

بیتے ہوئے لمحات کا اک فلم ہے گویا
گذرے ہوئے حالات کا منظر ہے تری یاد

یکسر وہی رونق، وہی خوبی، وہی شوخی
تیری ہر اک انداز کا پیکر ہے تری یاد

مجھ پر غمِ ہستی کا اثر ہو نہیں سکتا
عشرت کا چھلکتا ہوا ساغر ہے تری یاد

کیا رنج دل آویز محبت نے دیا ہے
پہلو میں کھٹکتا ہوا نشتر ہے تری یاد

ہر آفتِ دشوار کا آسان مداوا
ہر درد میں چلتا ہوا منتر ہے تری یاد

مانند سحر! میری امیدوں کے چمن میں
تابندہ و شاداب گلِ تر ہے تری یاد

پرواز ہے اب حسنِ معانی کی فضا میں.
شاہینِ سخن کے لئے شہپر ہے تری یاد

روشن ہیں مرے شعر ترے فیض نظر سے
آئینۂ افکار کا جوہر ہے تری یاد

ترتیب سے محفوظ ہیں رنگین بہاریں
گلدستۂ اوراقِ مصوّر ہے تری یاد

لاتی ہے یہ تجھ کو مری خلوت میں سراپا
ہر آن ترے ذکر سے بہتر ہے تری یاد

ملتا ہے ترے وصل کا انعام دوبارہ
اے غنچہ دہن قندِ مکرّر ہے تری یاد

ساغر صدیقی

دل کی آگ جوانی کے رخساروں کو دہکائے ہے
بہے پسینہ مکھڑے پر یا سورج پگھلا جائے ہے

من اک ننھا سا بالک ہے ہمک ہمک رہ جائے ہے
دور سے مکھ کا چاند دکھا کر کون اسے للچائے ہے

مے ہے تیری آنکھوں میں اور مجھ پہ نشہ سا طاری ہے
نیند ہے تیری پلکوں میں اور خواب مجھے دکھلائے ہے

تیرے قامت کی لرزش سے موجِ مے میں لرزش ہے
تیری نگہ کی مستی ہی پیمانوں کو چھلکائے ہے

تیرا درد سلامت ہے تو مرنے کی اُمید نہیں
لاکھ دکھی ہے یہ دنیا رہنے کی جگہ بن جائے ہے

سیف الدین سیف

★

چین اب مجھ کو تہہ دام تو لینے دیتے
تیرے فتنے کہیں آرام تو لینے دیتے

ہاتھ بھی تیری نگاہوں نے اٹھانے نہ دیا
دلِ بیتاب ذرا تھام تو لینے دیتے

پل میں منزل پہ اڑا لائے فنا کے جھونکے
لطف رگ رگ کے ہر گام تو لینے دیتے

آپنے اس کا تڑپنا بھی گوارا نہ کیا
دلِ مضطر سے کوئی کام تو لینے دیتے

موت بھی بس میں نہیں ہے ترے مجبوروں کی
زندگی میں کوئی الزام تو لینے دیتے

سیفؔ ہر بار اشاروں میں کیا اسکو خطاب
لوگ اس بت کا مجھے نام تو لینے دیتے

سراج لکھنوی

غزل

وہ دن کب آئے گا جب معتبر ہوگی وفاداری
ہے زیرِ غور ابھی تک میری ناکردہ گنہگاری

پلا، جلدی پلا ساقی! نئے جلوے دکھا ساقی!
ابھی تک میری انگڑائی ہے اک خوابیدہ بیداری

ریاکاری کے سجدوں سے بتوں کی بندگی بہتر
خلوصِ کافری کا نام ہے اسلامِ زنّاری

نگاہِ شوق کو پھر شکوۂ بیروزگاری ہے
جمالِ دوست یہ کب تک رہے گی سرد بازاری

پسِ مژگاں ابھی ٹھہرے رہیں آنسو ندامت کے
ابھی تو سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ ہے عذرِ گنہگاری

سراج اپنے لئے میں کیوں کسی سے روشنی مانگوں
ہے خود ہی آفتابِ حشر میرے دل کی چنگاری

سیدہ اختر

★

منزلِ مقصود سے کچھ آشنائی چاہیئے
خضرِ گم گشتہ سے کہہ دو رہنمائی چاہیئے

اے خدا دریائے ارباب طلب پر رحم کر
کاروانِ آرزو کو ناخدائی چاہیئے

اُن کے جلوؤں سے کوئی کہدے بہ اندازِ حجاب
آشنائی چاہیئے نا آشنائی چاہیئے

آپ میری وحشتِ غم کو سمجھتے ہیں مذاق
ابتداء کیا ہے؟ جنونِ انتہائی چاہیئے

ہے کہ پھر اس وقت دامانِ زلیخائے طلب
دامنِ یوسف کو پھر اک نارسائی چاہیئے

کہدو اربابِ تجسّس سے کہ اب عجلت کریں
مشکلِ دشوار کو عقدہ کشائی چاہیئے

تا کجا یہ بے حسی افتادگی واماندگی
اب مشیت کی ادا میں کبریائی چاہیئے

ہیچ ہیں نظروں میں اختر یہ خس و خاشاک ہند
آشیاں کے واسطے شعلہ نوائی چاہیئے

ساحرؔ لدھیانوی

★

طرب زاروں پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گذری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری

زمیں نے خون اُگلا آسمان نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری

ہمیں یہ فکر اُن کی انجمن کس حال میں ہوگی!
اُنھیں یہ غم کہ اُن سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گذری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گذری

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آگئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گذری

سلیمان اریب

★

تیری قربت تیری دُوری عالم عالم دُنیا دنیا
تجھ سے مل کر دل کی حالت محفل محفل تنہا تنہا

جانے کس کی بات بنے گی جانے کتنی بات بڑھے گی
تیرا پہلو ایک گلستاں میری وحشت صحرا صحرا

تیرے غم سے پھوٹ بہے ہیں جانے کتنے غم دنیا کے
تیرا دامن ستر آنکھوں پر میرے آنسو دریا دریا

تم نے کتنے عشق کئے ہیں عشق کی یہ توہین نہیں ہے
کو ہکنی سے میخواری تک عشق ہمیشہ رسوا رسوا

ظلمت ظلمت چیخنے والو جھلمل جھلمل تارے دیکھو
صبح فردا روشن روشن پنہاں پنہاں پیدا پیدا

سحاب قزلباش

★

محبت میں سکوں محرومیوں کے بعد آتا ہے
کہ جب ہر آسرا مٹ جائے جب دل چین پاتا ہے

خود اپنا ہی لہو آواز کو رنگیں بناتا ہے
کہ جل جاتا ہے جب دل تب کہیں نغمہ سناتا ہے

یہ کیا جبرِ مشیت ہے یہ کیا جبرِ صداقت ہے
کہ جسکو ہم بھلانا چاہتے ہیں یاد آتا ہے

یہ کیا ضد ہے کہ دنیا بھی رکھو اور دل نہ میلا ہو
یہ دنیا خوش ہی تب ہوتی ہے جب دل ٹوٹ جاتا ہے

کرم کیسا ہمیں تو نرم لہجہ سے بھی دہشت ہے!
طبیعت خوش تو ہو جاتی ہے پر دل دھڑدھڑاتا ہے

سلام مچھلی شہری

★

اڑتی ہے موجِ صبح میں یوں نسترن کی بات
جیسے کہ پیرہن سے کسی کے بدن کی بات

بڑھتا رہے گا قصۂ ہستی کا انتشار
چھڑتی رہے گی عارض و چشم و دہن کی بات

اب کی تو پائے ناز کی چھاگل بھی بار ہے
اس سال راس آئیگی اک برہمن کی بات

کرنے لگی ہے ان کو پریشان آجکل
ناہیدِ کاشمیر و نگار ختن کی بات

لینا ہے پھر سے صبح بہاراں کا جائزہ
شبنم نے چھیڑ دی ہے دلِ یاسمن کی بات

اے موسم خزاں کے شرارو تمہیں بتاؤ
کیوں جاوداں ہے اب بھی گل و نسترن کی بات

اس شدتِ الم میں بھی اے دل کسی کی یاد؟
اس موسم جواں میں شرابِ کہن کی بات

ٹوٹا جو سازِ فکر تو اے بزمِ لکھنؤ
یاد آگئی "یگانۂ غالب شکن" کی بات

ہنستے رہے ہیں یوں ہی سلام اہل انجمن
چبھتی رہی ہے دل میں مگر اہل فن کی بات

ساغر نظامی

★

وہ میری جولانگاہ نہیں وہ میرا فرش خواب نہیں
جس دریا میں طوفان نہیں جن موجوں میں گرداب نہیں

اشکوں میں تلاطم اب بھی ہے گو سینے میں سیلاب نہیں
جو دریا دل میں سوکھ گیا وہ آنکھوں میں پایاب نہیں

افتادہ و جامد خاک میں بھی بیتاب ہے سوزِ مواجی
سطح دریا بے آب سہی روح دریا پایاب نہیں

خود میری نظر اپنے پہ نہیں کیا شمس و قمر کیا شام و سحر
وہ کونسی شے ہے فطرت میں جو میرے لئے بیتاب نہیں

ابھرے ہوئے سینوں کے ساغر یہ جام چھلکتی آنکھوں کے
پیتے ہوئے صدیاں بیت گئیں اور عشق ابھی سیراب نہیں

ہستی ہے بظاہر اے ساغرؔ آئینۂ خواب و بیداری
اور پھر بھی جیتا ہوش نہیں اور پھر بھی ہستی خواب نہیں

شاعر لکھنوی

وہی مزاج مشیت کا رخ بدلتے ہیں
جو حادثوں کو سہارا بنا کے چلتے ہیں

غمِ حبیب سے پایا غمِ جہاں نے فروغ
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جلتے ہیں

نہ مل سکے گا کبھی ان کو منزلوں کا سراغ
جو ہر قدم پہ نئے کارواں بدلتے ہیں

تمام عمر کی قربت کے باوجود اکثر
نگاہِ دل میں بڑے فاصلے نکلتے ہیں

جو چپ رہیں تو ہے فصلِ بہار پر الزام
جو مسکرائیں تو سینوں کے زخم جلتے ہیں

مقام دار و رسن ہو کہ عالم زنداں
ہم اہلِ عشق کے تیور کہیں بدلتے ہیں

بہ فیضِ عشق ملے ہیں جو غم مجھے شاعر
وہ شعر بن کے مری زندگی میں ڈھلتے ہیں

شفیق جونپوری

جبتک جنوں پہ عقل کو قرباں نہ کرسکے
ہم زندگی میں کارِ نمایاں نہ کرسکے

کہتے ہو لوگ قدرِ بہاراں نہ کرسکے
تم بھی تو انتظامِ گلستاں نہ کرسکے

دنیائے نو کے عہدِ ترقی پہ آفریں
انساں جہاں تصوّرِ انساں نہ کرسکے

سو بار منتخب ہوئے وہ صدرِ انجمن
مشکل کسی کی ایک بھی آساں نہ کرسکے

وا حسرتا کہ صبحِ وطن کے قریب میں
ہم احترامِ شامِ غریباں نہ کرسکے

باغی بھی دے سکے نہ مساوات کو فروغ
اتنا بھی تو یہ دشمنِ ایماں نہ کرسکے

جس نے بنا دیا ہو زمانے کو جامہ زیب
وہ آج احتیاطِ گریباں نہ کرسکے

بس اس قدر رہا کہ بغاوت کی دھوم ہے
تم بھی کسی غریب کا درماں نہ کرسکے

دیتے ہیں درسِ ہمّت پروانہ کیا شفیق
آتش کدے کو آپ گلستاں نہ کرسکے

شکیل بدایونی

لاکھ دستورِ وفا دنیا سے اُٹھتا جائے ہے
آج بھی لیکن کوئی انساں نظر آجائے ہے

گاہے گاہے دیکھتے ہیں وہ محبت سے مجھے
رفتہ رفتہ زندگی کا راز کھلتا جائے ہے

بھول جاتا ہوں غمِ دوراں کو دَم بھر کے لئے
جب کوئی زہرہ جبیں میرے قریب آجائے ہے

زاہدو یہ بھی سمجھ لینا کہ جنت کا مکیں
ایک ہی لغزش میں جنت سے نکالا جائے ہے

حسن کے اشکِ ندامت کی الٰہی خیر ہو
آسماں سے اک ستارہ اور ٹوٹا جائے ہے

ہیں وہی گیسو مگر پہلی سی وہ خوشبو نہیں
ہیں وہی عارض مگر کچھ رنگ اُڑتا جائے ہے

جام رہے ساقی یہ دنیا دیکھ لینے دے مجھے
کچھ نظر آتا نہیں جب تو نظر آجائے ہے

کتنی کیف آگیں ہے تاثیرِ مئے الفت شکیل
دوست پیتا جائے ہے دشمن بہکتا جائے ہے

شعری بھوپالی

★

محبت ہی محبت کا زمانہ چاہتا ہوں میں
اسی دُنیا کو عقبیٰ بھی بنانا چاہتا ہوں میں

محبت کے الم جب ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں
جنوں کی آڑ لیکر مسکرانا چاہتا ہوں میں

ترے صدقے خیالِ یار تنہا چھوڑ دے مجھکو
کہ اپنے حال پر آنسو بہانا چاہتا ہوں میں

وہ میری مصلحت آمیز مجبوری کہ جب مجھکو
ہنسی آتی نہیں اور مسکرانا چاہتا ہوں میں

محبت میں مری سادہ مزاجی تو کوئی دیکھے
کہ اُن کا راز اُن سے ہی چھپانا چاہتا ہوں میں

جسے سب دیکھ کر یہ عرض کرتے ہیں کہ ہم تیری
قیامت ہو اسے اپنا بنانا چاہتا ہوں میں

کہاں تک دُوریٔ پیہم پریشاں ہو گیا شعری
حجابِ دیدہ و دل بھی اٹھانا چاہتا ہوں میں

شمیم کرہانی

★

غمِ سفر سے نہ گھبرا قدم بڑھائے چل — غبارِ راہ ہے منزل کی مانگ کا صندل

میں دیکھتا ہوں کہ ہاتھوں میں سنگِ وحشت لئے — اُدھر چلا ہے زمانہ جدھر ہیں شیش محل

وداعِ ہوش کی منزل تھی دید کی منزل — نظر جو آئی تو نظروں سے ہو گئے اوجھل

نہ چھوڑ آج کے جادے کو آج منزل ہے — کہ رہروانِ طلب کی تھکن کا نام ہے کل

حیات جنبشِ پیہم سے نغمہ آگیں ہے — اُٹھیں نہ پاؤں تو رہ جائے بے صدا پایل

نظامِ نو میں نظامِ کہن کا زہر ہے کیوں — کہیں بدل تو نہیں دی ہے سانپ نے کینچل

بٹھا نہ دے کہیں منزل کے راستہ میں تھکن — بہت جو تجھ کو ہے جلدی تو اتنا تیز نہ چل

بجبرِ قہر ہوا میں سکون ہو تو گیا — مگر دلوں سے ابھی تک گئی نہیں ہلچل

کسی کا چاکِ گریباں ہے بے رفو اب تک — شریکِ نکہتِ گل ہو گیا ترا آنچل

سجا نہ جسم کو پوشاکِ نو بنو سے شمیم
بدل خیال کے بوسیدہ پیرہن کو بدل

یہ بھی تھی حسرت نمو کی جلی
بجھ رہی ہے سلگ سلگ کے کلی

کچھ نشانِ سحر بھی ہے اے شبِ غم
ہے کہاں تک یہ تنگ و تار گلی

بے خبر تجھ سے تیری یاد اچھی
صبح وعدہ سے شام ہجر بھلی

کتنے حشر اٹھ کے شرمسار گئے
اس کی زلفوں کی رات ہی نہ ڈھلی

دل میں بس کر رہا خیال اس کا
کچھ ارادوں کی پیش ہی نہ چلی

دلفگاری کہ لالہ کاری ہے
سادگی ہے کہ حکمتِ عملی

دیکھئے دیکھئے بہار آئی
لیجئے لیجئے وہ بیت چلی

غزل

ظہیر کاشمیری

کاہن ہو یا راہ نما اب نہ کسی کی چال میں آؤ
ماضی مردہ، حال اندھیرا، مستقبل کی خیر مناؤ

آج کی تنہائی سے نکلو، کل کی آبادی میں آؤ
جاناں کی تربت سے اٹھو، دوراں کو سینے سے لگاؤ

دل کا ویرانہ بھی وہی ہے، تیری تمنا بھی ہے وہی
ظلمت میں روشن ہے ستارا، صحرا میں جلتا ہے الاؤ

دار تو ہے اک حیلۂ جلوہ دار سے ہم نے دیکھا ہے
سنولاں جسم گلابی چہرہ چال قیامت نرم سبھاؤ

بے آئینہ بے شانہ بھی اس کی سج دھج قائم ہے
زلفِ گیتی کی مت پوچھو ایک بگاڑ اور لاکھ بناؤ

ٹیڑھی نردیں الٹے خانے مدمقابل بے اسلوب
یہ چوسر کا کھیل بھی کیا ہے چال چلو اور منہ کی کھاؤ

میں تو گھائل ہو کر چپ تھا، لوگ ہی سب کچھ جان گئے
خون کے دھبّے بول رہے ہیں آؤ جھوٹی قسمیں کھاؤ

تم بھی ظہیر اس دنیا میں اضدادِ جنوں پر زندہ ہو
قریہ قریہ ہنستے گدا اور بستی بستی آگ لگاؤ!

صفی لکھنوی

★

پوچھنا چھیڑ کے بیداد کسے کہتے ہیں
اب ستم ادستم ایجاد کسے کہتے ہیں

دیکھنا ضبط، ترے ناز اُٹھانے والے
اُف بھی کرتے نہیں، فریاد کسے کہتے ہیں

تو بھی سمجھا کبھی اس لفظ کے معنی کمبخت
شادمانی، دلِ ناشاد کسے کہتے ہیں

کیا خبر اُن کو جو ہیں صحنِ چمن میں آزاد
قفس و خانۂ صیّاد کسے کہتے ہیں

صفیؔ اس عہد میں جس کے ہوں بہت سے شاگرد
وہی استاد ہے، استاد کسے کہتے ہیں

★

صابر دہلوی

میری جانب سے جو منھ پھیر کر ہوئے جاتے ہیں آپ
آج کچھ بیگانے بیگانے نظر آتے ہیں آپ

ہے اسی کا نام شاید ارتباطِ حسن و عشق
جب کبھی ہوتا ہے دل میں درد یاد آتے ہیں آپ

کیوں مرے دردِ آشنا دل پر ستم کم کر دیے
کیا مرے ذوقِ طلب میں کچھ کمی پاتے ہیں آپ

کیا قیامت ہے کہ دے کر اضطرابِ مستقل
اور اس پر صبر کی تلقین فرماتے ہیں آپ

مجھ سے جب کوئی تعلق ہی نہیں ہے آپ کو
کیوں مری رودادِ غم پر جھوم سے جاتے ہیں آپ

اس قدر بیگانگی صابر سے اتنی بے رُخی
سوچئے تو دل میں کیا سے کیا ہوئے جاتے ہیں آپ

عبدالمجید عدم

★

یہ الگ بات ہے ساقی کہ مجھے ہوش نہیں
ورنہ میں کچھ بھی ہوں احسان فراموش نہیں

نکہتِ گل بھی ہے اک دستِ نازک کی مثال
بارِ ہستی سے کوئی چیز سبکدوش نہیں

آہ وہ قرب کہ ہے دوریٔ انزوں کی دلیل
ہائے وہ وصل کہ آغوش در آغوش نہیں

ہوش خمیازۂ مستی ہے تو مطلب یہ ہے
جسکو کچھ ہوش ہے اسکو بھی کوئی ہوش نہیں

مے نے یوں تیز کیا ہے مرے اندیشے کو
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے میں مے نوش نہیں

آج اندازۂ مستی کا تعین کیسا
آج تو تیری نظر کو بھی کوئی ہوش نہیں

بیخودی میں مرا آغوش ہے مجھ سے آگے
شرم مت کیجئے میں شامل آغوش نہیں

اس مروت سے وہ معبود ہوا ہے عریاں
مجھ کو آدابِ عبادت کا بھی کچھ ہوش نہیں

کس طرح بیٹھ گئے وہ مرے پہلو میں عدمؔ
شک یہ پڑتا ہے کہ شاید مرا آغوش نہیں

عرش ملسیانی

★

ہر صورت سے ہر عنواں سے تخریبِ گلستاں دیکھ چکے
آغازِ بہاراں دیکھ چکے انجامِ بہاراں دیکھ چکے

اب عزم کا شعلہ بھڑکے گا اب شوق کی بجلی چمکے گی
ہم صبحِ وطن کی راہ بہت اے شامِ غریباں دیکھ چکے

سینہ تو ملا پر درد مگر درماں پہ اُسے قدرت نہ ملی
مختاریٔ یزداں کے صدقے مجبوریٔ انساں دیکھ چکے

ہم رنگِ بہاراں دیکھیں گے کہتے تھے بڑی امیدوں سے
یاد آئی خزاں کی بے رنگی جب رنگِ بہاراں دیکھ چکے

اب بزمِ حریفاں دیکھیں گے اخلاص کی دولت کیخاطر
اللہ بچائے اس سے ہیں ہم محفلِ یاراں دیکھیں گے

جس جانِ سخن کا چرچا ہے پردے میں ہے وہ اے عرش ابھی
کتنوں سے سنیں نظمیں ان کی کتنوں کو غزلخواں دیکھ چکے

عبدالمجید بھٹی

★

تابِ نظارۂ نگاہ کامیاب — نیند نے دیکھا ہے بیداری کا خواب

تابشِ رُخ سے جلے سرو و سمن — ہوگئی کشتِ تمنا باریاب

آبروئے عشق کیا پرکھی گئی — غیرتِ حسن آگئی زیرِ نقاب

شعلے اُٹھے ہیں کچھ ایسے چارسو — اور بھڑکیں گے جو گھر آئے سحاب

اے دلِ دیوانہ اب سمتِ سفر — دوریٔ منزل پہ کیمی ہے اضطراب

جرأتِ اظہار تو کھوئی گئی — لرزشِ لب ہی سہی خانہ خراب

زندگی ہے اِک عذابِ مستقل
موت پر بھی موت سے ہے اجتناب

عبدالمجید سالک

٭

ساقیٔ ماہ وش اُٹھا گردشِ جام ہو چکی
چاند غروب ہو گیا رونقِ بام ہو چکی

قید میں طے ہوئی تمام سود و زیاں کے مرحلے
ہم قفسو! کشاکشِ دانہ و دام ہو چکی

غلبہ دیں ہجومِ غم کوئی کرے تو کیا کرے
شے جو تھی مایۂ نشاط وہ تو حرام ہو چکی

مہرِ منیر کیا ہوا، نورِ سحر کہاں گیا
یہ تو بجا کہ پو پھٹی رات تمام ہو چکی

میری وفا کا ماجرا ہو گیا پردہ تر ترا
تیری جفا کی داستاں خلق میں عام ہو چکی

سالکِ غافل اب تو جاگ بجھ گئی آرزو کی آگ
زیست کا دن گزر گیا، عمر کی شام ہو چکی

عبد الباری آسی

نظر نیچی عرق آیا ہوا سا
ملا بھی وہ تو شرمایا ہوا سا

دل اک غنچہ ہے باغِ آرزو کا
وہی رہتا ہے کمھلایا ہوا سا

مرا افسانہ سنکر کیا کروگے
کچھ الجھا سا کچھ الجھایا ہوا سا

بہاروں میں کھڑا ہوں بیخودی کی
ہے دل پر ابرِ غم چھایا ہوا سا

ابھی تک جلوۂ مستور تیرا
نہ بھولا سا نہ یاد آیا ہوا سا

کہاں تاریکیٔ قسمت نے پھینکا
دھندلکا ہر طرف چھایا ہوا سا

نہ کی احباب نے تعمیر دل کی
یہ کعبہ رہ گیا ڈھایا ہوا سا

نئی کیا بات ہے بزمِ جہاں میں
ہر افسانہ ہے دُہرایا ہوا سا

ترے اک وعدۂ موہوم پر بھی
پھرا برسوں میں گھبرایا ہوا سا

اسی کا نام ہے شاید محبت
جو ہے اک انقلاب آیا ہوا سا

نہ جانے کون سے عالم میں ہوں میں
نہ کھویا سا نہ کچھ پایا ہوا سا

جوانی میں نظر آیا ہے سو بار
زمانے پر شباب آیا ہوا سا

گناہوں سے ابھی توبہ نہیں کی
مگر کچھ دل ہے پچھتایا ہوا سا

بتائیں کون ہے آسیٔ مضطر
وہ اک انسان گھبرایا ہوا سا

چاند ستاروں سے کیا پوچھوں کب دن میرے پھرتے ہیں
وہ تو بچارے خود ہیں بھکاری ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
جن گلیوں میں ہم نے سکھ کی سیج پہ راتیں کاٹی تھیں
ان گلیوں میں بیاکل ہو کر سانجھ سویرے پھرتے ہیں
روپ سروپ کی جوت جگانا اس نگری میں جوکھم ہے
چاروں کھونٹ بگولے بن کر گھور اندھیرا پھرتے ہیں
جن کے شیام برن سائے میں میرا من سستایا تھا
اب تک آنکھوں آگے وہ بال گھنیرے پھرتے ہیں
کوئی ہمیں بھی یہ سمجھا دو ان پر دل کیوں ریجھ گیا
تیکھی چتون بانکی چھب والے بہتیرے پھرتے ہیں
اک دن اس نے نین ملا کے شرما کے مکھ موڑا تھا
تب سے سندر سندر سپنے من کو گھیرے پھرتے ہیں
اس نگری کے باغ اور من کی یارو لیلا نیاری ہے
پنچھی اپنے سر پہ اٹھا کر اپنے بسیرے پھرتے ہیں
لوگ تو دامن سی لیتے ہیں جیسے ہو جی لیتے ہیں
عابدؔ ہم دیوانے ہیں جو بال بکھیرے پھرتے ہیں

سید عابد علی عابد

علی احمد

یہ کون اُٹھا ہے مسکراتا قدم بڑھائے نظر جھکائے
جبینِ ہوش و خرد ہوئی گم، نگاہ کے پاؤں ڈگمگائے

نگاہ پہلے لگی تھی در سے، مگر جمی ہے اب آسماں پر
یہ صبح کا آخری ستارہ بھی ہو نہ ایسا کہ ڈوب جائے

رہِ محبت میں ایک ایسا بھی وقت آتا ہے زندگی میں
سکون و راحت سے جب ہو وحشت آفت و غم میں چین آئے

وہ دن بھی کیا دن تھے زندگی کے کہ جب ترستے تھے فصلِ گل کو
دعائیں اب تو یہ ہو رہی ہیں خدا کرے فصلِ گل نہ آئے

ہوا جہاں تو قریبِ منزل سمجھ کہ موت آئی جستجو کی
ہے تلاطم کی زد پہ کشتی، کہیں یہ ساحل پہ آ نہ جائے

ہمارے گھر کی یہ ظلمت اے برق دور اُس وقت تک نہ ہوگی
اس آشیاں کا ہر ایک تنکا چراغ جب تک کہ بن نہ جائے

علی اسیری سے تنگ آ کر دیے ہیں کیا کیا فریب دل کو
قفس کے تنکوں کو جمع کر کے قفس ہی میں آشیاں بنائے

عارفِ عبدالمتین

رُوح کی تشنگی نظر کی جلن
دامنِ دشت ہو کہ صحنِ چمن

سوچتا ہوں کہ تیری چاہت کو
نغمۂ جاں کہوں کہ شعلۂ تن

تو اگر سن سکے تو نغمۂ زیست
ورنہ دل کی صدا فقط دھڑکن

کس خرابے میں زیست آپہنچی
میں تہی دست تو تہی دامن

ہے غمِ راہِ زیست کی مظہر
تیری زلفوں کی ایک ایک شکن

لے اُڑی صبح تیرا اُجلاپن
شام لائی ترا سلونا پن

دوپہر کو ملی جلا تیری
نیم شب نے چرائی تیری پھبن

عارفؔ بے نوا ترے در سے
لے کے آیا اک آبروئے سخن

عرشی بھوپالی

★

سرفراز اب کے بہت عشق میں اے یار ہوئے
جان پہ کھیلے کبھی رسوا سرِ بازار ہوئے

دوست بیگانے بنے، اقربا اغیار ہوئے
ہم محبت کی قسم کھا کے گنہ گار ہوئے

تجھ میں اے دوست کوئی بات تو دیکھی ہو گی
بے سبب تو نہ ترے لوگ پرستار ہوئے

ہم کبھی سہل نہ سمجھے تھے وفا کی منزل
امتحاں تیری محبت کے سرِ دار ہوئے

طعن کرتے ہو مری آہِ سحر گاہی پر
کتنے آتش کدے اس آہ سے گلزار ہوئے

پھر نہ ہی دشت نوردی نہ ہی منزل کا جنوں
پھر سے پیدا مری تلوؤں میں نہ خار ہوئے

غلام ربانی تاباں

سر تا بہ قدم ایک حسیں راز کا عالم
کیا کہئے کسی فتنہ گرِ ناز کا عالم

زلفوں میں وہ برسات کی راتوں کی جوانی
عارض میں وہ انوارِ سحر ساز کا عالم

عنوانِ سخن، غالب و مومن کا تغزل
اندازِ نظر، بادۂ شیراز کا عالم

دزدیدہ نگاہوں میں اِک الہام کی دُنیا
نازک سے تبسم میں اِک اعجاز کا عالم

ہر جنبشِ ابرو میں محاکات کے دفتر
کچھ سوز کا عالم ہے تو کچھ ساز کا عالم

اُلجھے ہوئے جملوں میں شرارت بھی حیا بھی
جذبات میں ڈوبا ہوا آواز کا عالم

اِس سادگیٔ حسن میں کس درجہ کشش ہے
ہر نازِ یہ اک جذبۂ غماز کا عالم

اِس صید کو کیا کہئے جو خود آئے تہِ دام
دل میں لئے اک حسرتِ پرواز کا عالم

قربت بھی ہو دُوری بھی ہو اب کیا کوئی سمجھے
انجام کا عالم ہے کہ آغاز کا عالم

یوں تو نہ تساہل نہ تجاہل نہ تغافل
کچھ اور ہے اس کافرِ طناز کا عالم

شوخی میں شرارت میں متانت میں حیا میں
جو راز کا عالم تھا وہی راز کا عالم

فیض احمد فیض

★

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گذری سو گذری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فراق گورکھپوری

٭

زہے آب و گل کی یہ کیمیا ہے چمن کی معجزۂ نمو
نہ خزاں ہی کچھ نہ بہار کچھ وہی خار و خس وہی رنگ و بو

مری شاعری کا یہ آئینہ کرے ایسے کو ترے رو برو
جو تری ہی طرح ہو سر بسر جو تجھی سے ملتا ہو مو بمو

یہ کہاں سے بزمِ خیال میں اُمنڈ آئیں چہروں کی ندیاں !
کوئی ہے چکاں کوئی خوں فشاں کوئی زہر وش کوئی شعلہ رو

گہے باغِ حسنِ عدن عدن گہے داغِ حسن ختن ختن
تب و تاب روئے سحر نمو خم و پیچ زلف سیاہ مو

وہ ادائے عذرِ ستم نہ تھی وہ تھا کوئی جادوئے سامری
مجھے آج تک نہیں بھولتی وہ نگاہِ نرگسِ حیلہ جو

یہ سنا ہے مرجعِ خلق ہے اب اسی کا تکیہ زمانے میں
جو فراق تیرے لئے پھرا کبھی در بدر کبھی کو بکو

غزل

فضل کریم فضلی

تمھیں اک نہیں جانستاں اور بھی ہیں
بہت حادثاتِ جہاں اور بھی ہیں

حسیں اور بھی ہیں جواں اور بھی ہیں
غزالانِ ابرو کماں اور بھی ہیں

تمھیں علم جن کا ہے ان کے علاوہ
غریبوں کو مجبوریاں اور بھی ہیں

چلو دھوم سے جشنِ ماتم منائیں
ہمیں اک نہیں نوحہ خواں اور بھی ہیں

نقاب اس نے رُخ سے اٹھائی تو لیکن
حجابات کچھ درمیاں اور بھی ہیں

فریبِ کرم اک تو ان کا ہے اس پر
ستم میری خوش فہمیاں اور بھی ہیں

وفا ان سے اپنی جتانے گئے تھے
مگر اب تو وہ بدگماں اور بھی ہیں

مجھ ہی کو اٹھاتے ہو کیوں انجمن سے
وہیں تو ہوں میں کئی جہاں اور بھی ہیں

نہیں ختم کچھ آسماں پر خدائی
میرے حال پر مہرباں اور بھی ہیں

ادب گاہِ فن نام جس کا غزل ہے
یہاں فن کی پابندیاں اور بھی ہیں

نہیں صبر کی ہی کمی تجھ میں فضلی
مِری جان کچھ خامیاں اور بھی ہیں

قدیر لکھنوی

★

یہ حسن و عشق کے رموز کوئی کیا جانے
پرائی آگ میں کیوں جل رہے ہیں پروانے

بہک نہ جائیں کہیں رند ہو کے مستانے
بقدرِ ظرف دیے جا رہے ہیں پیمانے

نمازِ عشق پڑھیں رند کب خدا جانے
کھلے رہیں در توبہ کی شکل میخانے

ہنسیں نہ آپ مری ڈبڈبائی آنکھوں پر
بھرے ہوئے ہیں چھلکنے لگیں گے پیمانے

ابھی تو صرف نشیمن پہ آنچ آئی ہے
چمن میں گل ابھی کیا کیا کھلیں خدا جانے

بہا ہے صحنِ چمن میں جو بلبلوں کا لہو
لکھے ہوئے ورقِ گل پہ ہیں وہ افسانے

ابھی تو شمع جلی بھی نہیں سرِ محفل
پروں کو تول رہے ہیں ابھی سے پروانے

نظر کا ان سے ملانا تو یاد ہے لیکن
پھر اسکے بعد مجھے کیا ہوا خدا جانے

بہارِ گلشنِ دل پر خزاں کا عالم ہے
قدیرؔ کسکی نظر لگ گئی خدا جانے

قتیل شفائی

افق کے اس پار زندگی کے اداس لمحے گذار آؤں
اگر مرا ساتھ دے سکو تم تو موت کو بھی پکار آؤں

کچھ اس طرح جی رہا ہوں جیسے اٹھائے پھرتا ہوں لاش اپنی
جو تم ذرا سا بھی دو سہارا تو بار ہستی اتار آؤں

بدل گئے زندگی کے محور طواف دیر و حرم کہاں تک
تمہاری محفل اگر ہو باقی تو میں بھی پروانہ وار آؤں

کوئی تو ایسا مقام ہو گا جہاں مجھے بھی سکوں ملیگا
زمیں کے تیور بدل رہے ہیں تو آسماں کو سنوار آؤں

گزر گئے مے فروش لمحے خمار سا ہے سودہ بھی کیا ہے
تمہیں بتاؤ کہاں سے لیکر نوید جشن بہار آؤں

سنا ہے اک اجنبی سی منزل کو اٹھ رہے ہیں قدم تمہارے
برا نہ مانو تو رہنمائی کو میں سر رہ گذار آؤں

قیوم نظر

اک موت ہے سہارا
کس زندگی نے ملا

بدلے تو ہم ہی بدلے
ہارا تو وقت ہارا

کیا شے ہے تیرگی میں
کیوں ٹوٹتا ہے تارا

طوفان سے ہم بھی گزرے
لیکن وہی کنارا

اِک ذرّہ رہ گیا تھا
عالم ہے پارا پارا

منزل کی جستجو تھی
ہر نقشِ پا سنوارا

پھر خاک کر گیا ہے
اُمید کا شرارا

دل چاہتا ہے لیکن
تم کیوں ملو دوبارا

کیفی چریا کوٹی

غزل

مرے دامن پہ جو میری نظر سے گرنے والے ہیں
وہ کل آنسو دلِ بیتاب کے سانچے میں ڈھالے ہیں

گلہ کیا سخت جانی کا؟ غمِ سنگیں دلی گیتا
خدا کی مکارسازی سے بتوں کے سب حوالے ہیں

نظرِ عرفاں کی خدوخال پہ ڈالی ہے جب ڈالی
بتوں کے پوجنے والے بڑے اللہ والے ہیں

محبت میں لٹا کر اپنا سب کچھ ہم نے سمجھا ہے
دل ان کا ہے نظر ان کی جو اپنے کو سنبھالے ہیں

کسی کروٹ میں دل خنجر کسی کروٹ میں دم نشتر
شبِ غم کاٹ دینے کو نئے پہلو نکالے ہیں

خدا کے نام پر کچھ مانگتے ہیں بھیک جلوے کی
بھکاری ہم ہیں آنکھیں بھیک کے دونوں پیالے ہیں

تری جنت مری دنیا میں مرگ و زیست کیا کہئے
وہاں مرنے کی دشواری یہاں جینے کے لالے ہیں

یہ سورج دن کا شب کا چاند کیا ہیں بامِ گردوں پر
نگاہوں نے مری نقشِ قدم تیرے اچھالے ہیں

نگاہِ لطف و اندازِ کرم ہے لوٹنے والے
دلِ بیتاب اور جانِ حزیں نازوں کے پالے ہیں

میرا ایمان تیرا حسن ہے تیرے دو عالم میں
مرے گھر سے ترے گھر تک محبت کے اجالے ہیں

میں اب سمجھا ہوں اے کیفیؔ جنوں پہنچا ہی منزل تک
کھٹک دل میں وہی باقی ہے کانٹے ہیں نہ چھالے ہیں

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

★

کیا حاجت بادہ خواری کی کیا مطلب ہے میخانے سے
او مست نظر والے ساقی دو گھونٹ اسی پیمانے سے

کچھ شمع ہی پر موقوف نہیں قائم ہیں کچھ پروانے سے
جب حسن و محبت ملتے ہیں بن جاتے ہیں افسانے سے

نیت تری برحق لیکن، اے چارہ گر بس رہنے دے
کچھ ایسے زخم بھی ہوتے ہیں جو چبھتے ہیں بھر جانے سے

یوں کعبے پر ایمان تو تھا اور اب بھی ہے سوچا یہ تھا
کیا منہ دکھلائیں گے جا کر گر لوٹے ہم بت خانے سے

شکوے تیرے بھی نہ سہی پر دل میں سحر تو سوچ ذرا
اس سیمہ پا تک گلشن کو کیا نسبت ہے ویرانے سے

گوپی ناتھ امن لکھنوی

★

درد کی دل سے آشنائی ہے
فطرت انساں کی کیا بھلائی ہے

تیرے گستاخ بندی کہتے ہیں
یہ خدائی کوئی خدائی ہے

بُعدِ منزل کا اعتراف نہیں
اعترافِ شکستہ پائی ہے

رشک دل میں حیاتِ رنداں کا
قابل زید پارسائی ہے

آستانِ نیاز قائم ہے
ہائے یہ کیسی جبہ سائی ہے

اُن کا میرے سلام پر کہنا
کہ سلام اس کی روستائی ہے

مسکراتا ہوں بات کے بدلے
ایسی کچھ دل پہ چوٹ کھائی ہے

اتنی آہستہ ، اتنی شرماتی
یہ صبا کیا پیام لائی ہے

ہر طرف جنگ کی ہے تیاری
امن کی جان پر بن آئی ہے

دل آج تنگ ہے لطفِ فراواں سے شرمسار
لب آج تک ہیں آپ کا شکوہ لئے ہوئے

کل شب طلوعِ ماہ کا منظر عجیب تھا
تم جیسے آگئے رُخِ زیبا لئے ہوئے

ہر ایک شخص ترکِ تمنّا کا مدعی
ہر ایک شخص تیری تمنّا لئے ہوئے

چشمِ سیہ میں مستیاں شامِ وصال کی
عارض فروغِ صبح نظارا لئے ہوئے

بے گانہ مآل چلا جا رہا ہے کون
عرضِ نیازِ عشق کا سودا لئے ہوئے

منوّر لکھنوی

★

بتاؤں کیا کہ غرض کیا سفر میں رکھتا ہوں
یہی بہت ہے کہ منزل نظر میں رکھتا ہوں

مری حیات کا، میری بقا کا ضامن ہے
وہ ایک درد جو پیہم جگر میں رکھتا ہوں

شبک نگاہ نہیں اس کے مول سے واقف
بہت گراں ہے وہ سودا جو سر میں رکھتا ہوں

مری روش سے سمجھ لے نہ کوئی غیر مجھے
سنبھل کے پاؤں خود اپنے ہی گھر میں رکھتا ہوں

اسی کو مانگنے آتی ہیں بجلیاں مجھ سے
چھپی سی آگ جو اک بال و پر میں رکھتا ہوں

یہ کون شام کو دیتا ہے دید کی دعوت
سحر کے وقت یہ کس کو نظر میں رکھتا ہوں

نگاہ میں ہے منوّر ہر اک نشیب و فراز
سنبھل سنبھل کے قدم رہگذر میں رکھتا ہوں

ماٰنی جائسی

★

اور کیا بزمِ کائنات میں ہے
موت ہی دامنِ حیات میں ہے

اک تزلزل سا کائنات میں ہے
کیا تسلسل تغیرات میں ہے

حسن کو اب ہے آرزوئے وفا
اور کیا رازِ التفات میں ہے

سر بکف میں ہوں اور وہ تیغ بکف
عشق اب ان تعلقات میں ہے

اب بہشتی گھڑی ہے دید کا وقت
دن میں شامل ہے یہ نہ رات میں ہے

جور تو جور لطف بھی قاتل
ایک ہی بات، بات بات میں ہے

مطمئن دل ہے کامیاب نظر
تو جہانِ تصورات میں ہے

وہ تڑپ آسکی نہ لفظوں میں
ہائے جو دل کی واردات میں ہے

غم ہی کھانا پڑے گا اے ماٰنی
غم ہی گنجینۂ حیات میں ہے

فراق گورکھپوری

مٹ جانے دو عالم کو مٹنے ہی کے قابل تھا
جو رنگ تھا فانی تھا جو نقش تھا باطل تھا

ناکامیٔ حسرت کی اللہ رے نیرنگی
دکھتا ہوا چھالا ہے پہلے جو کبھی دل تھا

مجبور رہا سچ ہے، مجبور رہا سچ ہے
کب آپ سے بیگانہ کب آپ سے غافل تھا

گرداب میں رہ جانا جو گزرے وہ سہہ جانا
تقدیر کا قائل ہوں دو ہاتھ پہ ساحل تھا

وہ چاکِ گریبانی وہ بے سروسامانی
سودا زدہ دیوانو میرا بھی کبھی دل تھا

وہ تشنگیٔ الفت وہ لذتِ سیرابی
تو موجۂ دریا میں خمیازۂ ساحل تھا

ماہر القادری

★

جاتے ہو تو جاتے ہوئے اک تیرِ نظر اور — یہ غم مری طاقت سے زیادہ ہے مگر اور

اے اہلِ نظر ایک توجہ کی نظر اور — اشکوں کے گہر اور ہیں شبنم کے گہر اور

ان برق مزاجوں سے ہے الفت میں سروکار — جو رات میں کچھ اور ہیں اور وقتِ سحر اور

ہم اُٹھ کے تری بزم سے جائیں تو کہاں جائیں — ہے اس کے سوا بھی کوئی فردوسِ نظر اور

اے شوخیٔ رفتار بس اک گام کی زحمت — باقی ہیں ابھی راہ میں کچھ خاک بسر اور

یہ اور قیامت ہے کہ بے رنگ ہیں آنسو — حالت ہے مری اور یہ دیتے ہیں خبر اور

آندھی کے گزرنے پہ نہ ہوں اہلِ چمن شاد — آئے گا ابھی مرحلۂ برق و شرر اور

اِن دیکھنے والوں کی دو رنگی کوئی دیکھے — جلوہ پہ نظر اور ہے پردہ پہ نظر اور

ماہرؔ کو ہے اب خاص نوازش کی ضرورت
اک چوٹ ابھی بے واسطۂ دردِ جگر اور

جاگ اے نسیمِ باخندہ گلشن قریب ہے
اُٹھ اے شکستہ بال نشیمن قریب ہے

تاریک رات اور بھی تاریک ہو گئی
اب آمد آمدِ مہہِ روشن قریب ہے

لَو دے اٹھا ہے سازِ جفا کا ہر ایک تار
ہنگامِ رقصِ آتش و آہن قریب ہے

ایوان و پاسباں کے حجابات بے محل
اس دشتِ شوق سے تر دامن قریب ہے

ہر سانس انتشارِ فراواں سے بے قرار
اس کارواں سے کیا کوئی رہزن قریب ہے

ان بجلیوں کی چشمکِ باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

مجروح سلطانپوری

باعثِ جلوۂ گل دیدۂ تر ہے کہ نہیں
میری آہوں سے بہاراں کی سحر ہے کہ نہیں

راہِ گم کردہ ہوں کچھ اسکو خبر ہے کہ نہیں
اُسکی پلکوں پہ ستاروں کا گذر ہے کہ نہیں

میرے ہونٹوں پہ تڑپتے ہیں ابھی تک شکوے
جانے اسکی وہی نیچی سی نظر ہے کہ نہیں

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آگر
سوچتا ہوں یہ تری راہ گذر ہے کہ نہیں

تیز ہو دستِ ستم دے بھی شراب اے ساقی
تیغ گردن پہ سہی جام سپر ہے کہ نہیں

روئے مشرق کی قسم ہم کو ہے اتنا معلوم
شبِ دوراں ترے پہلو میں سحر ہے کہ نہیں

میں جو کہتا تھا سوا اے رہبرِ کوتاہ خرام
تیری منزل بھی مری گردِ سفر ہے کہ نہیں

اہلِ تقدیر یہ ہے معجزۂ دستِ عمل
جو حزف میں نے اٹھایا وہ گہر ہے کہ نہیں

دیکھ کلیوں کا چٹکنا سرِ گلشن صیاد
زمزمہ سنج مرا خونِ جگر ہے کہ نہیں

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

محوی صدیقی لکھنوی

کچھ کچھ خفا خفا جو انھیں پا رہے ہیں ہم
پھر دل کسی کی یاد سے بہلا رہے ہیں ہم
اُس نے جو مسکرا کے نظر کی ذرا ادھر
کیا اب بھی کھانا چاہتے ہیں کچھ فریبِ عیش
یہ تفرقے تجھی کو مبارک ہوں ہم صفیر!
چلتا نہیں ہے زور کچھ اپنے نصیب پر
میں نے کہا نہ بے گی مری قبر اب یہیں
قسمت سے جنگ کر کے نتیجہ بھی دیکھ لیں

اپنی نظر سے آپ گرے جا رہے ہیں ہم
جو آگ بجھ رہی تھی وہ بھڑکا رہے ہیں ہم
کیا کیا نصیبِ عشق پہ اترا رہے ہیں ہم
سو سو طرح سے دل کو جو سمجھا رہے ہیں ہم
اڑ کر چمن سے اور کہیں جا رہے ہیں ہم
سر اُن کے پائے ناز سے ٹکرا رہے ہیں ہم
کہنے لگے جب ہی تو نکلوا رہے ہیں ہم
اُن سے جو لو لگائے وہاں جا رہے ہیں ہم

محویؔ ہے اک عذاب یہ فکرِ امید و بیم
اس کشمکش سے اور گھلے جا رہے ہیں ہم

ڈاکٹر مسعود حسین

غزل

خدا کرے کہ ترا غم دراز ہو جائے
غمِ حیات سے کچھ ساز باز ہو جائے

مری نگاہ کی کوتاہیاں مسلّم ہوں
تری نظر کا اگر کچھ جواز ہو جائے

دلِ گرفتہ میں صدہا تہیں تبسّم کی
ذرا یہ کاوشِ مژگاں سے باز ہو جائے

زبانِ شوق میں تفسیرِ داغِ دل یہ ہے
بڑھے تو دردِ نہ گھٹے کے راز ہو جائے

جھکیں وہ آنکھیں فلک بھی جھکا، جھکے مسعود
سب اس خیال میں رسمِ نیاز ہو جائے

محمود سرمدش

★

ہیں انکی نظروں کے اب فسانے جو کل تھے قلبِ حزیں کے قصے
پہنچ گئے آسماں پہ آخر زمیں سے چل کر زمیں کے قصے

سنیں وہ روداد اہلِ محنت جو قیس و کسریٰ کے ہیں فدائی
کہ جیب و دامن سے بھی زیادہ حسین ہیں آستیں کے قصے

تمہاری مجبور منطقوں سے خدا یہ بات آگئی نہ زاہد!
برا ہی کیا تھا جو رہنے دیتے زمین ہی پر زمین کے قصے

ہیں داغ دل اور خونِ حسرت کی نامکمل سی داستانیں
لہو کی سرخی کے یہ فسانے یہ دیدۂ سرمگیں کے قصے

فلک پہ جیدم مقام ہوگا فلک کی باتیں کریں گے ہمدم
ابھی تو وابستہ ہیں زمیں سے ابھی کہیں گے یہیں کے قصے

اگر ہے خود اعتماد کوئی تو فیصلے کی سنادے باتیں!
سرمدش کبتک رہیں گے یونہی یہ ان کی ہاں اور نہیں کے قصے

مظفر شاہجہانپوری

★

قبلِ آغاز ہی انجام کا ڈر ہوتا ہے
دُور اندیش بڑا تنگ نظر ہوتا ہے

غیر کے غم سے بھی اب دل پہ اثر ہوتا ہے
کوئی روتا ہے تو دامن مرا تر ہوتا ہے

اپنے ہی غم میں جو برسے وہ ہیں آنسو لیکن
غیر کے درد میں ٹپکے تو گُہر ہوتا ہے

قطرۂ آب سے بھی کم ہے جو چھلکا آنسو
پی لیا جائے تو صد برق و شرر ہوتا ہے

آ کے تھم جائے پلک پر جو نہ ٹپکے نہ ہو جذب
اشک لرزاں نہیں وہ رقصِ شرر ہوتا ہے

سیکڑوں ہجر کی راتوں سے بھی اتنا نہ ہُوا
ایک فاقے سے بُرا جتنا اثر ہوتا ہے

بھیک دیتا ہو کوئی یا وہ طلب کرتا ہو
دونوں صورت میں بشر ننگِ بشر ہوتا ہے

بات جب ہے کہ چھٹے ظلمتِ دوراں ایدوست
روز ورنہ سفرِ شمس و قمر ہوتا ہے

اِس نئے دَور میں ماضی کی پرستش جیسے
سر پہ سورج ہے اندھیرے میں سفر ہوتا ہے

صبح کو ہم نے شام کیا
یہ بھی کتنا کام کیا

خلوت کی کچھ باتیں تھیں
جن کو ہم نے عام کیا

اہلِ حرم تو کیا کرتے
بت کو ہم نے رام کیا

زلف کے دلکش سائے میں
کتنی دیر آرام کیا

عارض کی سرخی لے کر
ساغر کو گلفام کیا

آنکھوں کی کچھ مستی تھی
جس کو شریکِ جام کیا

زاہد تو حجرے میں رہا
رندوں نے کچھ کام کیا

ہم بھی ہوئے بدنام مجید
مے کو بھی بدنام کیا

مجید امجد

★

ایک ایک جھروکا خندہ بہ لب ایک ایک گلی کہرام
ہم لب سے لگا کر جام ہوئے بدنام بڑے بدنام

•

رت بدلی کہ صدیاں لوٹ آئیں اُف یاد کسی کی یاد
پھر سیلِ زماں میں تیر گیا اک نام کسی کا نام

•

روندیں تو یہ کلیاں نیشِ بلا، چومیں تو یہ شعلے پھول
یہ غم یہ کسی کی دین بھی ہے انعام عجب انعام

•

رہ رہ کے جیالے راہیوں کو دیتا ہے یہ کون آواز
کونین کی ہنستی منڈیروں پر تم ہو کہ غمِ ایّام

•

ہم فکر میں ہیں اس عالم کا دستور ہے کیا دستور
یہ کس کو خبر اس فکر کا ہے دستور دو عالم نام

مختار صدیقی

★

جو جو صدمے ہم پر گذرے کیسے اُن کا بیاں کریں
کون سا داغ نکال کے دل سے ثبت سرِ دیواں کریں

ہم پر تہمت رکھیں اُن کے باب میں کوئی گماں کریں
یاں پر فرشتے دخیل نہیں ہیں جو بھی کریں انسان کریں

آٹھ پہر آشفتہ خیالی کس کو بھلا خوش آتی ہے
جی مانے تو ہم بھی کچھ دل جمعی کا سامان کریں

ہم مجبور سدا سے رہے ہیں اپنے مزاج کی وحشت سے
کر پائیں تو دنیا داری ہم بھی ہر عنوان کریں

جب ہے قفس کا گوشہ چھوٹا ایک ہی دگدا رہتی ہے
جینا مشکل مرنا مشکل کیا مشکل آسان کریں

یار احباب نہ جانے کیوں ان روز دنوں ہم سے گریزاں ہیں
دشمن ہی اب حال پر اپنے شاید کچھ احسان کریں

مسعود اختر جمال

★

زندگی کی بہار لے کے چلے
دامنِ تار تار لے کے چلے

گل رخانِ چمن کی محفل سے
سینۂ صد نگار لے کے چلے

مل گئی خوابِ عشق کی تعبیر
عالمِ انتظار لے کے چلے

بے قراری میں عمر گذری تھی
آج دل کا قرار لے کے چلے

پا گئے رازِ خندۂ گل ہم
دیدۂ اشکبار لے کے چلے

دوستو خوش رہو جہاں بھی رہو
ہم دلِ سوگوار لے کے چلے

کیفِ ہستی نہ ٹوٹنے پائے
ہم اجل کا خمار لے کے چلے

جسکو حاصل ہے عشرتِ جاوید
وہ غمِ روزگار لے کے چلے

مل گئی دادِ آبلہ پائی
پرسشِ نوکِ خار لے کے چلے

ظلمتِ جبرِ بے پناہ سے ہم
شعلۂ اختیار لے کے چلے

ضبطِ غم کا جمالؔ ہے یہ صلہ
طعنۂ غم گسار لے کے چلے

موج علیگ

★

یہ سچ ہے کچھ مصلحت سے چھیڑا تھا بزم میں ذکرِ یار ہم نے
نہ جانے کس کس جتن سے روکی تھی گردشِ روزگار ہم نے

جنوں کی بے اعتمادیاں بھی جنوں کی بے اعتمادیاں تھیں
تمہاری دانش وری کے قصے سنائے گو بے شمار ہم نے

بہار کا انتظار کب تک کہ رنگ محلوں کے جام چھلکیں
خود اپنے اشکوں سے دھو لیا ہے بجھے دلوں کا غبار ہم نے

اگر اندھیروں سے انسیت تھی اگر بڑھانا تھا تیرگی کو
تو شب کے آنچل پہ کیوں ابھارے لہو سے نقش و نگار ہم نے

یہ آبگینے جو چور ہوں گے تو رحمتوں کا بھرم کھلے گا
ہمارے جذبات کو نہ چھیڑو کہا تھا یہ بار بار ہم نے

حدودِ دوراں میں موج ہم نے ہجوم دیکھا ہے رہبروں کا
تو دل کے صحرا میں ڈھونڈ لی ہے کوئی نئی رہگذار ہم نے

نوح ناروی

★

آغازِ محبت میں اسے سوچ رہا ہوں
دل دوں کہ نہ دوں میں انھیں چاہوں کہ نہ چاہوں

اِک نقشِ قدم نقشِ وفا نقشِ محبت
میں ہوں کہ نہیں کچھ بھی اگر ہوں بھی تو کیا ہوں

یوں ہوش مری بیخودیٔ شوق نے کھوئے
میں اُن کا پتہ خود اُن ہی سے پوچھ رہا ہوں

ہر وقت مجھے یاد نہ کیوں آئے اُسی کی
جس کے لئے اپنے کو بھی میں بھول گیا ہوں

دنیا کے طلسمات کو مجھ سے کوئی پوچھے
میں پھنس بھی چکا ہنس بھی چکا رو بھی چکا ہوں

غم کی نہ شکایت نہ مسرت کی تمنا
دنیا جو دکھاتی ہے مجھے دیکھ رہا ہوں

کیوں تذکرۂ عہدِ وفا پر ہے خموشی
کہہ دو کہ مجھے یاد نہیں بھول گیا ہوں

وہ سب سے بھلے سب سے بھلے سب سے بھلے ہیں
میں سب سے بُرا سب سے بُرا سب سے بُرا ہوں

اتنا بھی نہیں ہے خودیٔ شوق میں معلوم
کون آپ ہیں کیا آپ ہیں میں کون ہوں کیا ہوں

اے نوح اٹھا کرتے ہیں طوفان وہیں سے
میں بحرِ محبت میں جہاں ڈوب گیا ہوں

نجم آفندی

★

عمر بھر پرورشِ فکر و نظر ہوتی ہے
زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

کچھ غریبوں کی شب ایسی بھی بسر ہوتی ہے
گھر میں اندھیر زمانے میں سحر ہوتی ہے

کس قیامت کی کشاکش ہے دوراہے پہ نہ پوچھ
نہ اِدھر ہوتی ہے دنیا نہ اُدھر ہوتی ہے

کچھ خبر بھی ہے تجھے موت سے ڈرنے والے
زندگی موت کے دامن میں بسر ہوتی ہے

سوچتا کیا ہے شبِ غم بھی گذر جائے گی
دیکھتا کیا ہے گھڑی بھر میں سحر ہوتی ہے

انقلاب آتے ہی تشکیلِ توازن کے لئے
وحدتِ امن جہاں زیر و زبر ہوتی ہے

کل یہ ممکن ہے کہ سامان رہے سر نہ رہے
آج بیشک سر و ساماں میں بسر ہوتی ہے

تو بھی اے ہمتِ نو منزلِ نو پیدا کر
ہر سحر اک نئی دنیا کی سحر ہوتی ہے

نجم پندارِ ہنر کوئی بڑا جرم نہیں
یہ بھی اک لغزشِ اربابِ ہنر ہوتی ہے

نیاز فتحپوری

★

ہو بُرا تیرا نگاہِ شوق وہ جانِ حیات
دیکھ تو کیسا پسینہ میں نہایا جائے ہے

اِس تصور میں کہ اُن کے میرے لب ہوں متصل
ایک نقطہ پر سمٹ کر زندگی آجائے ہے

سنگ کیا ہے بس سراپا انتظارِ بت تراش
زندگی کا خواب لوگو! یوں بھی دیکھا جائے ہے

وہ خنک سی تابناکی اس کے رنگِ جسم کی
مجھ کو تو اس چاندنی میں نیند سی آجائے ہے

اپنے دم سے تھا نیاز اِک انجمن لیکن غریب
جائے ہے دنیا سے آج اور کیسا تنہا جائے ہے

غزل

ناصر کاظمی

آرائشِ خیال بھی ہو جاں فزا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اس رنجِ بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ٹوٹے کبھی تو حسنِ شب و روز کا طلسم
اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو

دیوانگیِ شوق کو یہ دھن ہے ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے در و دیوار سا بھی ہو

جز دل کوئی مکان نہیں دہر میں جہاں
رہزن کا خوف بھی نہ ہو اور در کھلا بھی ہو

ہر شے پکارتی ہے پسِ پردۂ سکوت
لیکن کسے سناؤں کوئی ہم نوا بھی ہو

فرصت میں سُن شگفتگیِ غنچہ کی صدا
یہ وہ سخن نہیں جو کسی نے کہا بھی ہو

کیوں چیختے ہیں تپتی دوپہروں میں قمریاں
وہ جانتا ہے جس کا کبھی دل دکھا بھی ہو

بیٹھا ہے ایک شخص مرے پاس دیر سے
کوئی بھلا سا ہو تو ہمیں دیکھتا بھی ہو

پھرتے ہیں کیسے کیسے خیالات ذہن میں
لکھوں اگر زبانِ قلم آشنا بھی ہو

بزمِ سخن بھی ہو سخنِ گرم کے لئے
طاؤس بولتا ہو تو جنگل ہرا بھی ہو

ناز ش پرتاب گڈھی

★

وہ چشمِ ناز بھی نظر آتی ہے آج نم
اب تیرا کیا خیال ہے اے انتہائے غم

اے حُسن اب تو کوئی اشارہ ملے کہ ہم
آ گئے نکل چکے ہیں تری در سے کئی قدم

یہ ذکرِ دار و گیر بہر حال آئے گا
افسانۂ حیات کہیں سے سنائیں ہم

کچھ اہلِ کارواں ہی سمجھتے ہیں مشکلیں
کہنے کو راستے میں کوئی پیچ ہے نہ خم

آؤ دیار دار سے ہو کر گذر چلیں
سنتے ہیں اُس طرف سے مسافت رہیگی کم

اپنے لہو سے کیوں نہ بڑھائیں سحر کا رنگ
طولِ شبِ حیات کہاں ہو رہی ہے کم

نازشؔ نہ آہٹیں ہیں نہ سائے نہ راہزن
اب کتنی دُور رہ گئے اسکی گلی سے ہم

نخشب جارچوی

★

بھری انجمن تھی مگر ہمیں اِک اُمید تھی جو مچل گئے
کہیں اُس نے بڑھ کے اٹھا لیا تو نصیب جانو بدل گئے

تری جستجو میں گئی نظر ہمیں اسقدر نہ رہی خبر
تری دُھن میں اکثر و بیشتر ترے سامنے سے نکل گئے

اُلجھنوں میں بڑھا جنوں اسی کشمکش میں گیا سکوں
جو ہی واقعہ وہی کہہ نہ دوں کہ وہ وعدہ کر کے بھُول گئے

بھری انجمن میں لگاؤ کا بڑی مشکلوں سے بھرم رہا
میں نظر ملا کے جھجک گیا وہ نظر بچا کے سنبھل گئے

غزل

نریش کمار شاد

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے

جس نے پیدا کئے حسیں اس نے
کیا دل آویز شاعری کی ہے

بعض اوقات، دیدہ ور کے لئے
تیرگی نے بھی روشنی کی ہے

آپ سے یوں تو اور بھی ہوں گے
آپ کی بات آپ ہی کی ہے

رنگ بھر دیجئے نگاہوں سے
بے دلوں کی حیات پھیکی ہے

عقل سے صرف ذہن روشن تھا
عشق نے دل میں روشنی کی ہے

زندگی کو بسر کیا ہم نے
یا بالاقساط خودکشی کی ہے

غم نے دل کو کہاں جلایا ہے
غم نے ہی دل میں روشنی کی ہے

اپنی گمراہیوں نے بھی اکثر
رہ نوردوں کی رہبری کی ہے

ہم نے اپنا سمجھ کے دنیا کو
آپ اپنے سے دشمنی کی ہے

اہلِ دل نے ہمارے شعروں پر
واہ کے ساتھ آہ بھی کی ہے

شاد، دل شاد بھی ہو یا تم نے
اک ذرا غم سے دل لگی کی ہے

حیدر آبادی

باغِ ہستی سے بچشمِ تر چلے
ہائے کن پھولوں سے دامن بھر چلے

آج آنکھیں کس قدر سنسان ہیں
ہر دیارِ غم کو ویراں کر چلے

ان کو کانٹوں کا سہارا بھی نہیں
جو ہمیشہ تختۂ گل پر چلے

پھر وہی ہم ہیں وہی تاریکیاں
ساتھ تھوڑی دور تک رہبر چلے

لے ہجوم شکوہ سنبھال چھٹ گیا
زندگی خوش ہو کہ ہم تو مر چلے

رسم میخانہ نبھائی تھی نظرؔ
تشنہ لب آئے تھے ساغر لے چلے

نسیم فیروز

غزل

وہ جلوہ جو کہ ضروری تھا عمر بھر کے لئے
ہم آج اس کو ترستے ہیں اک نظر کے لئے

سرِ نیاز بھٹکتا ہے تیرے در کے لئے
ترس رہی ہیں دعائیں مری اثر کے لئے

بنا کے میرے نشیمن کو برق کا مرکز
فلک نے چھوڑ دیا مجھ کو دربدر کے لئے

بچا کے رکھا تھا رنگینیٔ جہاں سے جسے
خبر نہ تھی کہ وہ دل ہے تری نظر کے لئے

بہر سُو آج بھی جلوے ہیں منتشر لیکن
کہاں سے لاؤں میں وہ نور اب نظر کے لئے

سکوت و تیرگیٔ غم اور اک دلِ بیتاب
نگاہیں رہتی ہیں بے چین سی سحر کے لئے

کسی کے دردِ محبت کی آرزو نے نسیم
خدا سے مانگ لیا مجھ کو عمر بھر کے لئے



برق حسرت شمار دیکھیے کب تک رہے
ہم کو یقین بہار دیکھیے کب تک رہے

دامن گلچیں میں پھول، بلبل شیفتہ ملول
روحِ چمن سوگوار دیکھیے کب تک رہے

کتنے نئے قافلے منزلوں سے جا ملے
بخت میں اپنے غبار دیکھیے کب تک رہے

دیکھیے کب راہ پر ٹھیک سے اٹھیں قدم
رات کی مے کا خمار دیکھیے کب تک رہے

خدمتِ بے دام پر نظمِ کہن برقرار
نظمِ کہن برقرار دیکھیے کب تک رہے

اہلِ جنوں خوب ہیں واقفِ آئینِ شوق
دل پہ مگر اختیار دیکھیے کب تک رہے

دیکھیے کب تک نظر بزم میں بھٹکا کرے
حسرتِ دیدارِ یار دیکھیے کب تک رہے

رات بھی مرجھا چلی چاند بھی کمھلا گیا
پھر بھی ترا انتظار دیکھیے کب تک رہے

انجمِ خاکی کا نور چشمِ نجومی سے دور
انجمِ فلک کا شمار دیکھیے کب تک رہے

حسرتِ انسان اور تابعِ مریخ و ماہ
جہل کا یہ اشتہار دیکھیے کب تک رہے

دیکھیے کب تک زمیں ذرّوں کی دشمن رہے
زیست کے رخ پر غبار دیکھیے کب تک رہے

کشمکشِ ننگ و نام دہر میں جاری مدام
نام کی یہ جیت ہار دیکھیے کب تک رہے

واثق سرگشتہ اور گردشِ لیل و نہار
وقت کا یہ کاروبار دیکھیے کب تک رہے

ہادی مچھلی شہری

★

افزائشِ وحشت کا اثر ہو کے رہے گا
ہم رنگِ بیاباں مرا گھر ہو کے رہے گا

مٹ جائے گا احساس فراوانیٔ غم میں
دل بے خبرِ شام و سحر ہو کے رہے گا

بے کار نہ جائے گا مرا خونِ کفِ پا
ہر خارِ بیاباں گلِ تر ہو کے رہے گا

وہ نالہ جو نکلے گا شبِ غم مرے دل سے
اُمید ہے گلبانگ سحر ہو کے رہے گا

اندازہ یہ ہوتا ہے فراوانیٔ غم سے
ہر اشک یمِ دیدۂ تر ہو کے رہے گا

فطرت کے تقاضوں سے توقع تو یہی ہے
جو غنچہ کھلا ہے وہ ثمر ہو کے رہے گا

گھبرائیے کیوں کشمکشِ بیم و رجا سے
یہ معرکۂ دل کبھی سر ہو کے رہے گا

آنکھوں سے مری چھپ نہیں سکتا ترا جلوہ
خود ذوقِ نظر روزنِ در ہو کے رہے گا

اک حال پہ قائم نہیں رہتا ہے زمانہ
ہنگامۂ شب عیشِ سحر ہو کے رہے گا

ہٹ جائینگی ہر چیز سے اک روز نگاہیں
جلوہ ترا پایانِ نظر ہو کے رہے گا

کیا نالۂ پیہم بھی نہ کام آئے گا ہادی
کیا غم مرا محرومِ اثر ہو کے رہے گا

ہری چند اختر

★

سُنا کر حال قسمت آزما کر لوٹ آئے ہیں
اُنھیں کچھ اور بیگانہ بنا کر لوٹ آئے ہیں

پھر اک ٹوٹا ہوا رشتہ پھر اک اُجڑی ہوئی دنیا
پھر اک دلچسپ افسانہ بنا کر لوٹ آئے ہیں

فریبِ آرزو اب تو نہ دے اے مرگِ مایوسی
ہم امیدوں کی اک دنیا لُٹا کر لوٹ آئے ہیں

خدا شاہد ہے اب تو کوئی ان سا بھی نہیں ملتا
بزعمِ خویش جنکو آزما کر لوٹ آئے ہیں

بچھے جاتے ہیں کیوں یارب کسی کافر کے قدموں پر
وہ سجدے جو درِ کعبہ پہ جا کر لوٹ آئے ہیں

یاس یگانہ چنگیزی

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

بُرا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پر
مگر فرمانِ آزادی بجا لانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منھ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

یوسف ظفر

غزل

طے کر چکے مراحلِ شمس و قمر کو ہم
اے کاش یہ خبر ہو کہ جائیں کدھر کو ہم

پھر آج دیکھ آئے ترے بام و در کو ہم
پھر دیکھتے ہیں غور سے اپنی نظر کو ہم

وہ جس نے راستوں کو بھی منزل بنا دیا
گم ہو کے ڈھونڈتے ہیں اسی ہمسفر کو ہم

اے کاش تم وہی ہو جو ہوتے ہو خواب میں
اے کاش ہم نہ یہ ہوں جو اٹھیں سحر کو ہم

کوئی سکوتِ ساز کو پہچانتا نہیں
پہنچے نہ سوزِ دل سے لبِ نغمہ گر کو ہم

آئے تھے تیرے دامن زمانے کی راہ سے
گھبرا کے تجھ سے جائیں تو جائیں کدھر کو ہم

امیدِ زندگی کی لگا کر دلوں میں آگ
بچھڑے تو پھر بچھڑ ہی گئے عمر بھر کو ہم

یوں ہی تو آؤ مل کے اٹھائیں غمِ حیات
تم بھی ادھر کو جاتے ہو شاید جدھر کو ہم

چشمِ امید نے تو ڈبویا بہت ظفر
اب آزمائیں حوصلۂ چشمِ تر کو ہم

یعقوب حسن

تو ہاتھ اُٹھائے لیتے ہیں خود ہی وفا سے ہم — سنتا نہیں ہے بات کریں کیا خدا سے ہم
کیوں خوفِ بیکسی میں دبیں آشنا سے ہم — جا سکتے ہیں اکیلے بھی راہِ وفا سے ہم
اُمید ہو تو کام بھی لیں التجا سے ہم — کیوں سر جھکا جھکا کے ملیں کج ادا سے ہم
دل کا سکون مانگنے پر اتنی ردّ و کد — جیسے خدائی مانگ رہے ہوں خدا سے ہم
قدرت وہی ہے ناز وہی بے رخی وہی — اُن کو ملا کے دیکھ رہے ہیں خدا سے ہم
بگڑا جو دل تو چھوٹ گئے اس کے گھر کی راہ — اب دشمنی تو کر نہیں سکتے خدا سے ہم
اُن کی مراد پوری ہو مقصد ہو کامیاب — مل جائیں خاک میں بھی تو انکی بلا سے ہم
سمجھا بجھا کے اپنے دلِ بے قرار کو — کرتے رہے اُمیدِ وفا بے وفا سے ہم
انسانیت کے نام پر دیتے ہیں جان سب — اب تم کہو تو ہاتھ اٹھالیں وفا سے ہم

پائے کوئی سکون کوئی چیختا رہے
انصاف چاہتا ہے کہ پوچھیں خدا سے ہم

ختم شد